بے سمت مسافر

رضیہ فصیح احمد

بے سمت مسافر

(افسانے)

رضیہ فصیح احمد

مکتبۂ اسلوب۔ کراچی

پہلی اشاعت	۱۹۷۸ء
دوسری اشاعت	۱۹۸۳ء
خطاطی	مظفر گجراتی
مطبع	حقی آفسٹ پریس۔ لیاقت آباد۔ کراچی
قیمت	پچیس ۲۵ روپے

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ کراچی ۱۸

چھوٹے بھائی

نعیم احمد

کے نام

جس نے سب سے پہلے میری تحریروں میں دلچسپی لی

فہرست

دیباچہ

پہلے ایک کہانی۔ مدت گزری ایک چھوٹی سی لڑکی تھی جس کی عمر بمشکل سات آٹھ برس ہو گی۔ اس نے کہیں پڑھا کہ شہزادہ سدھارتھ نے جو بہت ناز و نعم میں پل رہا تھا، راہ میں چلتے ہوئے ایک بیمار بچہ دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ لوگ بیمار کیوں ہوتے ہیں۔ پھر اس نے ایک لاغر بوڑھا دیکھا تو اس کا دل غم سے بوجھل ہو گیا، اور جب اُس نے ایک ارتھی دیکھی تو اپنے محل دو محلے اور اُن کا آرام تج کر یہ کھوجنے نکل گیا کہ دنیا میں اتنے دُکھ کیوں ہیں اور انسان کیسے ان سے نجات پا سکتا ہے۔ مدتوں مارا مارا پھرا۔ پنڈتوں گیانیوں سے ملا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر گیا میں جب وہ ایک درخت کے نیچے سمادھی لگائے بیٹھا تھا تو اسے گیان حاصل ہو گیا اور وہ مہاتما بدھ یعنی گیانی بن گیا۔ لڑکی بے حد خوش ہوئی مگر جب شہزادہ سدھارتھ گوتم بدھ بن گیا اور اس نے اپنی تعلیم دنیا کو دی تو اُس ننھّی منّی لڑکی کا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ وہ بے چاری تو یہ آس لگائے تھی کہ بدھ جی نے کوئی ایسا نسخہ ڈھونڈ لیا ہو گا جس سے بچوں نے بیمار ہونا، لوگوں نے بوڑھا ہونا اور مرنا چھوڑ دیا ہو گا۔

یہ بے وقوفیاں آگے بھی چلتی رہیں۔ ہر مضمون وہ یہی سمجھ کر پڑھتی کہ اب ساری گتھیاں سُلجھ جائیں گی، اب سارے رموز آشکارا ہو جائیں گے۔ یہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ نفسیات ہو یا تاریخ، عمرانیات ہو یا فلسفہ کوئی بھی مضمون مسئلے سلجھاتا نہیں اُلجھاتا ہے۔ اب ایسی بے وقوف لڑکی کیا کر سکتی تھی بجائے اس کے کہ قلم اٹھائے اور کہانیاں لکھنا شروع کر دے۔

پلٹ کر دیکھتی ہوں تو یہ ایک طویل سفر ہے اور ویسے بھی زندگی میں سفروں کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ بچپن سے سفر میری زندگی کا حصّہ رہے ہیں اور میرے ذہنی اور تخلیقی سفر کا تعلق یقیناً میرے جسمانی سفروں سے بھی ہے۔ حصولِ تعلیم کے لیے بہت کم عمری میں سفر میرے اوپر مسلّط کر دیے گئے تھے۔ چھ سات سال کی عمر میں گھر کی مفارقت بچوں کو بہت حساس بنانے کے ساتھ اُن کے اندر

..یا احساسِ تنہائی چھوڑ جاتی ہے جو ساری عمر نہیں جاتا۔ چنانچہ یہ سفر مجھے آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہیں جو مجھے کبھی گھر سے دور اور کبھی نزدیک کرتے تھے۔ والدین اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے دوری نے مجھے اسکول سے نزدیک تر کر دیا اور میں نے پڑھائی میں جان کھپانے کے علاوہ اسکول کے کھیلوں اور ڈراموں وغیرہ میں بھی دل کھول کر حصہ لیا۔ کتابوں میں مجھے بڑا سحر نظر آتا تھا۔ جیسے ان میں دیو پریاں چھپی بیٹھی ہوں۔ اور اُن دنوں پنسل سے کاغذ پر طرح طرح کے نقش و نگار اور پرندے بنایا کرتی تھی۔ میں یہ فن پارے اپنے والد صاحب کو دکھاتی تھی جو کہتے تھے چڑیاں بناؤ مگر ان کی آنکھ نہ بناؤ ورنہ گناہ ہوگا۔ چنانچہ کچھ بناتے کچھ چھوڑتے کہ ہر فن میں کچھ بنانے کے ساتھ کچھ چھوڑنا بھی ضروری ہوتا ہے میں ۴۷ء تک پہنچی۔

۴۷ء لاکھوں انسانوں کے لیے سفر اور ہجرت کا سال تھا۔ آزادی کی خوشیوں کے ساتھ دلوں پر نامعلوم مستقبل کے زیرِ اثر امید و بیم کے سائے تیر رہے تھے۔ گھروں میں والدین کے چہروں پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ اپنا گھر چھوڑ کر شہر میں غیروں کے ہاں پناہ لینا، ہر وقت حملوں کا ذکر اور پناہ گزینوں کی باتیں سننا زندگی کے عجیب و غریب اور گہرا اثر چھوڑنے والے تجربے تھے۔ اسکول کالج بند تھے مگر زندگی کے مکتب کھلے ہوئے تھے۔ ایک طویل سفر سامنے تھا، ہجرت کا سفر۔ جس میں لاکھوں اَن جانے ساتھی بھی تھے۔ جن میں خوف کے علاوہ ایک ہی منزل پر پہنچنے کی جدوجہد کا رشتہ تھا۔ اس سفر میں بھی ذہنی اُلجھنوں سے بچنے کیلیے جہاں کہیں میسّر آئے رسالوں اور کتابوں کا سہارا لیتی رہی۔

پاکستان آنے کے بعد اُن دنوں کی افراتفری، مالی مشکلات، گھر چھوڑنے اور جمنے کی کد و کاوش نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا تھا۔ نفسا نفسی کی اس فضا نے لڑکپن میں دلوں پر کچو کے بھی لگائے۔ اس عمر میں آدمی چونکہ کسی بات کا تجزیہ نہیں کر سکتا وہ دل ہی دل میں کُڑھتا رہتا ہے۔ یہاں بھی ذہنی سکون اور فرار کے لیے کتابوں میں پناہ لی اور ۴۸ء میں نویں کلاس کا امتحان دینے کے بعد پہلا افسانہ لکھا۔

اہلِ دانش و بینش یہ بحث اکثر چھیڑتے ہیں کہ تخلیق کا عمل اظہارِ ذات ہے یا اخفائے ذات۔ میرے نزدیک تخلیق کا عمل انسانی سائیکی کا کوئی ایسا پیچیدہ عمل ہے جس میں انشائے ذات بھی ہے اور اخفائے ذات بھی۔ ذات کہیں کُھل کر سامنے آنا چاہتی ہے کبھی چھُپ جانا چاہتی ہے تخلیق کار کبھی خواب دیکھتا ہے، کبھی دکھاتا ہے۔ اور یوں بھی نہیں ہوتا کہ کسی کے لکھنا شروع کر دینے سے

سارے مسائل حل ہو جاتے ہوں۔ بچے بیمار ہونا اور لوگ بوڑھا ہونا اور مرنا چھوڑ دیتے ہوں۔ لیکن مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش اور غم کا شعور دکھ کی شدّت کو کم ضرور کر دیتا ہے۔ میں کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ تو نہیں کرتی مگر یہ دیکھنے سے کہ ایک آدمی یہ کام کیوں کر رہا ہے۔ اکثر آپ کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو جاتی ہیں، اور آپ انھیں آسانی سے CONDEMN نہیں کرتے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں عام زندگی کے نیچے چھپی ہوئی زیرِ سطح لہریں دکھاؤں کہ بعض اوقات ان میں بڑا تضاد ہوتا ہے۔ پڑھنے والا جب ایسی تحریریں پڑھتا ہے تو اسے ان میں کچھ اپنے غم کی پرچھائیاں اور کچھ سچائیاں نظر آتی ہیں اور اسے تھوڑی سی تسکین ہوتی ہے کہ صرف وہی دکھوں میں مبتلا نہیں ہے اور لوگ بھی ہیں۔ صرف وہی چون اور چرا میں سرگرداں نہیں ہے اور بھی بہت سے ہیں۔

جب کبھی گھر کی بجلی فیل ہو جاتی ہے، بچہ فوراً ماں باپ کو آواز دیتا ہے اور جواب پا کر کسی حد تک مطمئن ہو جاتا ہے کہ اندھیرے میں وہ تنہا نہیں ہے۔ بس لکھنے والا بھی پڑھنے والوں کو یہی بتاتا ہے کہ تاریکی میں وہ تنہا نہیں ہے، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے اور بھی لوگ ہیں۔

لکھنے والا اس آلے کی طرح حساس ہوتا ہے جو ہزاروں میل دور ہوتے ہوئے بھی زمین کے ارتعاش کو محسوس کر لیتا ہے۔ دنیا میں محبّت کی نارسائیاں، معاشی ناہمواریاں، معصوم بچوں کی کربناک بیماریاں، سچّی قدروں کی ناقدری اور جھوٹی قدروں کی فراوانی، محنت کی بیل سوکھتے اور بے محنتوں کی تن آسانیاں پھلتے پھولتے دیکھ کر لکھنے والا جتنا کڑھتا ہے، شاید ہی کوئی کڑھتا ہو۔ اسی لیے کبھی دور دراز ہونے والے واقعات اور کبھی سیکڑوں سال بیشتر کے حادثات اُسے لکھنے پر اکساتے ہیں۔ وہ تاریخ کو کریدتا، ماضی کے ملبے سے مواد حاصل کرتا اور اس کے بارے میں لکھتا ہے اور جب وہ تحریر کسی اور کے دل و دماغ کو اس طرح چھوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس میں کہیں کوئی آفاقی سچائی ہے جو صدیوں پہلے زندہ تھی اور اب بھی مری نہیں ہے۔ غرضیکہ دنیا بھر کے دکھی انسان اپنی شخصیت کے ڈوبتے جہازوں سے ایس۔ او۔ ایس (S.O.S) یا MAY DAY کے سگنل بھیجتے رہتے ہیں جنھیں لکھنے والا پکڑ لیتا ہے اور انھیں دوسرے لوگوں تک پہنچانے کی سعی کرتا رہتا ہے۔

چنانچہ تخلیق کے پیچیدہ عمل نے تصویر بنانے کی راہ مسدود دیکھ کر مجھے دوسری طرح آلۂ کار

بنایا اور مجھ سے افسانہ لکھوایا۔ ابتدا افسانوں سے کی، اس کے بعد بچوں کی کہانیاں لکھیں، اور یوں اب لکھتے ہوئے اتنے برس گزر گئے ہیں کہ عورت ہونے کے ناتے تخلیقی عمر بتاتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیئے۔ لیکن میں پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے کو برسوں میں شمار کرنے کی قائل نہیں ہوں۔ جس طرح اچھا استاد وہ ہے جو سدا طالب علم رہے، اسی طرح کھرا لکھنے والا وہ ہے جو خود کو تازہ واردوں میں شمار کرے، نئے تجربے کرنے سے نہ گھبرائے، تنقید سے نہ ڈرے اور محض اس خوف سے لکھنا بند نہ کر دے کہ خدا جانے وہ اپنا سابقہ معیار برقرار رکھ سکے گا یا نہیں۔

۵۲ء میں ایف۔ اے کرتے ہی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد نئے سفر۔ فوج میں ہر دوسرے سال نئی جگہ تبادلہ۔ بقول بڑی بوڑھیوں کے گھر سدا ڈگیا میں رہا۔ نئی جگہ کے نئے فسوں، نئی پریشانیاں، نئی دوستیاں، نئے احوال، نئے اقوال، نئی زبانیں، نئے لوگ اور نئی نئی باتیں سننے کو ملیں، جو ڈیڑھ دو سال میں پرانی بھی نہ ہو پائیں کہ اٹھو اب کوچ کرو۔ کوچ کا نقارہ بج جاتا۔ اس افراتفری میں چند سال کے لیے لکھنا بند ہو گیا۔ تعلیم اور تحریر کا سلسلہ ۵۹ء میں پھر جوڑا۔ ۶۰ء میں بی۔ اے کا امتحان دیا اور باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔

کہتے ہیں کہ عورت کا دکھ عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ ہمارے ہاں جہاں مرد بھی کم مجبور نہیں ہیں عورتوں کی مجبوریاں دہری ہیں اور ان عورتوں کو برتر سمجھا جاتا ہے جو مخالفت کو یوں برداشت کریں جیسے کہیں کوئی ٹکراؤ ہی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ذہین اور فطین عورتوں کے لیے یہ سمجھوتے بعض اوقات بہت مشکل ہو جاتے ہیں۔ میرے افسانوں اور ناولوں کی عورتیں دکھ بھوگتی ہیں، اندر سے ٹوٹتی ہیں، سمجھوتے کرتی ہیں، جہاں تک ان کے بس میں ہو اور اس امید میں جیتی اور مرتی ہیں کہ شاید کبھی انھیں بھی فیصلے اور انتخاب کا حق ہو گا۔ لاشعوری سمجھوتے بعض اوقات عورتوں سے بہت سے روپ بہروپ بھرواتے ہیں۔ وہ تریا چرتر جو جگوں سے مشہور ہے، یہی روپ بہروپ ہی تو ہے۔ بعض عورتیں ذہنی خلفشار کو جسمانی بیماریوں میں ڈھال کر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرتی ہیں اور جو یہ بھی نہیں کر سکتیں وہ اپنی آگہی کی آگ میں جل جل کر خاکستر ہوتی رہتی ہیں، جیسے میرے ناولوں میں "آبلہ پا" کی صبا ہوئی، "انتظارِ موسم گل" کی تارہ ہوئی، "متاعِ درد" کی گل ہوئی یا "آزارِ عشق" کی صباحت ہوئی۔ "آزارِ عشق" میرا اب تک کا آخری ناول ہے جو ۶۹ء میں جب سب سے چھوٹا بچہ پیدا ہوا لکھا گیا۔

اسی سال کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے پریویس اور اگلے سال فائنل اردو میں کیا اور لکھنے کو افسانے تک محدود کر دیا کہ اب جا کر اندازہ ہوا کہ اچھا ناول بہت محنت، دقتِ نظر اور گہرا تنقیدی شعور چاہتا ہے۔ افسانوں کا کبھی شمار نہیں کیا۔ مگر بہت لکھے ہیں۔ جب لکھنا شروع کیا تھا، اس وقت ۵۳-۵۲ء میں علامتی افسانے بھی لکھے جن میں "بہار" "ہمایوں میں اور بگولوں کے دیس میں" ادبِ لطیف میں چھپا۔ اس کے بعد بھی لکھے۔ "وادی کی ہوا" "پل" اور اب حال میں "اڑان" "کام" اور "وہ ایک عجیب و غریب چشمہ تھا" وغیرہ۔ طویل افسانے بھی لکھے، مختصر افسانے بھی لکھے۔ انشائیے اور مزاحیہ مضامین اور ڈرامے بھی۔ اپنا ایک ڈرامہ جو فنون میں چھپا تھا اور نثری نظم میں لکھنے کی کوشش تھی، مجھے آج بھی پسند ہے۔ نام ہے "دشتِ نارسائی"۔

کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ میرے ناول افسانے اور ڈرامے ڈاک بنگلوں اور ہوٹلوں کے پس منظر میں کیوں ہیں۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ میرے بہت سے مشاہدے ان جگہوں سے متعلق ہیں۔ اب زندگی میں ایک جگہ بیٹھنے کو ملے بھی تو تھوڑے دن بعد دل گھبرا جاتا ہے۔ دل میں متضاد کیفیتیں ڈیرہ ڈالے رکھتی ہیں۔ قیام کی خواہش بھی، سفر کی تمنا بھی۔ دنیا کی سیاحت کا شوق بھی ہے اور سکون کی تلاش بھی ہے۔ لکھنا پڑھنا تو اب شوق نہیں رہا نشہ ہو گیا ہے۔

"دو پاٹن کے بیچ" افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ "بے سمت مسافر" دوسرا مجموعہ ہے جس میں پانچ طویل افسانے ہیں۔ "آگ اور پانی" کراچی کی ۱۹۶۷ء کی بے پناہ بارش کی یادگار ہے۔ کراچی آئی تو مجھے یہاں کی فضا میں ایک عجیب اضطراب رچا اور ٹھہرا ہوا نظر آیا تھا۔ جیسے کسی طوفان سے پہلے کی اذیت ناک خاموشی۔ شاید یہ ۶۹ء کے طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ یہ افسانہ یہاں کی فضا میں چھپے ہوئے اضطراب کو پیش کرنے کی حقیر سی کوشش تھی۔ "پہلی دراڑ" بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والوں کی کہانی ہے۔ "آشیاں گم کردہ" عورت کی ازلی بے بسی کی داستان ہے کہ جب گھر کا آنگن اور طاقوں بھری گڑیاں چھوڑ کر اسے بدیس جانا پڑتا ہے تو اپنی جڑیں چھوڑ کر نئی جڑیں پکڑنے میں وہ کتنی مرتبہ سوکھتی، جلتی، مرتی اور جیتی ہے ـــــ

"بے سمت مسافر" ان سفید پوشوں کی کہانی ہے جن کے سر سے اچانک سائبان اڑ جاتا ہے۔ اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے وہ کیسے کیسے کانٹوں پر چلتے ہیں اور کیا کیا دکھ اٹھاتے ہیں۔

آگ اور پانی پر سے گزر کر آنے والوں سے، بے سائبان زندگی گزارنے والوں سے اور بسم اللہ کے گنبد میں رہنے والوں سے مجھے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہے کہ لکھنے والا انھی چیزوں کے بارے میں لکھتا ہے جن سے اُسے ہمدردی ہو۔ سو میں نے کرداروں کے ذہن سے نکلنے والے ایس۔ او۔ ایس یا MAY DAY کے سگنل پکڑے ہیں اور انھیں دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ انھیں بچا سکتے ہیں تو بچالیں، نہ بچا سکیں تو اُن سے اور اُن جیسے دوسروں سے مُنھ نہ موڑیں کہ سارا قصور کبھی ایک ہی شخص کا نہیں ہوا کرتا۔ ان کو سمجھنے کی کوشش کریں، ان سے ہمدردی کریں کہ غمگساری پورا نہیں تو نصف علاج ضرور ہے۔

آپ مذاق نہ سمجھیں تو کہوں کہ مجھے دنیائے ادب کے بعض کردار اتنے پسند ہیں کہ ان سے ملنے کو طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی دوست سے ملے ہوئے بہت دن ہو جائیں تو بے اختیار ملاقات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ وہ کردار ہوتے ہیں جن کو ہم اُن کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا اپنے دوستوں کو۔ ان لوگوں نے بھی ہماری شخصیت کی نشو و نما میں مدد کی ہے۔ انسان اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے کچھ سیکھتا ہے تو اُن سے بھی ضرور اثر لیتا ہے۔ جو اُس کے ذہن میں زندہ ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ میں بھی دو ایک ایسے کردار چھوڑ جاؤں، جو دنیا کو اُسی طرح زندہ اور سانس لیتے ہوئے محسوس ہوں جیسے مجھے دوسروں کے کردار محسوس ہوتے ہیں۔ یہ کب ہوگا، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ابھی تو بس لکھتے رہنے کا ارادہ ہے۔ میں اپنی نظروں میں اتنے سفر اور اتنی منزلیں رکھنا چاہتی ہوں جو کبھی سر نہ ہو سکیں، منزلیں نشانِ راہ بنتی جائیں اور میں آگے بڑھتی جاؤں، یہ نہ ہو کہ منزلیں ایک ایک کر کے میرے سامنے دم توڑ دیں اور میرے لیے کچھ نہ رہے، سوائے اپنی پرانی چیزوں کے بارے میں باتیں کرنے کے۔ خواہ کچھ ملے نہ ملے منزل بہ منزل آگے چلتے رہنا مجھے عزیز ہے۔ سفر اور سفر۔

لکھنے میں فکری خلوص اور ادبی دیانت میرے نزدیک ضروری ہے اور ہمیشہ عالمی معیار نظر میں ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد کسی کو کیا ملے گا اور کتنے عرصے کے لیے یہ تو فقط آنے والا وقت اور آنے والا زمانہ ہی بتائے گا۔

کراچی یکم اگست ۱۹۸۳ء

رضیہ فصیح احمد

ڈائن

کچھ سعید اکیلا ہی نہیں تھا ان کے تین بیٹے اور بھی تھے جن کو انہوں نے
اتنے لاڈ پیار سے تو نہیں مگر خاصے اہتمام سے پرورش کیا تھا اور بڑے چاؤ سے
باری باری پھوپی، ماموں اور چچا زادیوں سے بیاہ دیا تھا اور کچھ دن بعد انہیں
یکایک احساس ہوا تھا کہ شادی کے بعد وہ سب ان سے آہستہ آہستہ انجانے
میں اس طرح جدا ہو گئے تھے جیسے چوٹ لگا ناخن انگلی سے۔ ان کے علاوہ انہوں
نے اپنے عزیزوں میں سے بھی کئی لڑکوں کو اپنے پاس رکھا، کسی کو میٹرک کرایا، کسی کو
ہوسٹل میں جگہ نہ ملنے تک ٹھکانہ دیا، کسی کے شہر میں کالج نہ ہونے کے سبب اپنے
پاس رکھنا پڑا۔ مگر یہ بھی جب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تو یوں انجان بن گئے
جیسے صرف دور کی عزیزداری ہی تھی۔ کبھی جھوٹوں کو یہ بھی نہ کہتے کہ ہمارے لائق کوئی خدمت
ہو تو ارشاد کریں۔ یوں منہ پھوڑ کر وہ کہتیں تو کر ہی دیتے مگر ایسی ان کی عادت نہ تھی۔
غرضیکہ یہ سب لونڈے ان کے گھر سے یوں گئے جیسے کھلیان کے آخری دانے کھاکر

چڑیاں پھُر سے اُڑ جاتی ہیں اور پھر ادھر کا رُخ نہیں کرتیں۔ اور ان کی اپنی ایک سگی بھانجی ندرت جو ان کی نند کی وفات کے بعد سے اُن کے ہاں رہتی تھی اور ان کا خیال تھا کہ انہیں لڑکوں میں سے کسی کے ساتھ اٹھا دیں گی وہ یونہی بیٹھی رہ گئی۔ شکل کی کچھ یوں ہی تھی غریب اور اس پر کچھ تھوڑی سی دماغ دار بھی۔ ممانی اٹھتے بیٹھتے کہتیں، نہ جانے یہ اپٹروُن پن ہے کس بات کا، مجھے تو کوئی ایسا ہنر نظر نہیں آتا جس پر اِتراتی اچھی لگیں۔ یوں بی اے کے بعد اس نے اسکول میں نوکری کر لی کہ جب دماغ اتنے اونچے تھے کہ کوئی اس میں سمائے ہی نہیں تو پھر اس کے سوا اور کیا کرتیں۔ اور اب ان کے لئے لے دے کے ایک سعید رہ گیا تھا۔ اور ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ سعید کے گرد یوں گھومتا تھا جیسے اس ایک ہستی کے سوا دنیا میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ان کا پیار پیٹ کی اور عزیزوں کی اولاد سے گزر کر وسعتِ زمان و مکان سے آزاد ہو کر آفاقی حدود کو چھو لے، لیکن ایسا نہ ہوا۔ ان کا پیار پھیلنے کے بجائے دن بدن سکڑ رہا تھا۔ آفاقی حدود کو چھونا تو ایک طرف، وہ اپنے پچھلے لینے دینے اور پچھلی بے لوث اور بے طلب محبت پر بھی پچھتاتیں، گویا پیار کا اتنا ڈھیر سا خزانہ یوں ہی لٹایا، بالکل فضول۔ اگر وہ بھی اسی ایک ہستی پر صرف ہوتا تو محنت سوارت ہو جاتی۔ اب تو پیار کا ایک ایک ریزہ دوسروں سے بچا کر اس لئے رکھا جاتا کہ سعید پر نچھاور کر دیا جائے۔ اس پیار کا اب کوئی حق دار نہ تھا۔ بڑے بیٹے سب کچے کانوں کے اور زن مرید نکلے کمبخت، انہوں نے خود کو اس کا اہل ہی ثابت نہیں کیا۔ کسی اور کو دینا سعید کے حصّے میں کمی کے مترادف تھا اور اس کے حصّے میں کمی کسی صورت گوارا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یوں سائل اور ضرورت مند خالی ہاتھ لوٹنے لگے ان میں خالی کیسے والے ہی نہ تھے ـــــ وہ بھی تھے جو دلی ہمدردیوں کے سوالی تھے، جو ایک نظرِ التفات کے متمنی اور ایک میٹھے

بول کے طلب گار تھے لیکن ان سب کے لئے بھی وقت درکار ہے اور ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ گنا ہوا تھا۔ سعید کے دفتر کے اوقات کچھ ایسے تھے کہ اس کے اور بھائیوں کے ناشتے اور کھانے کے وقت سے میل نہ کھاتے اور وہ اس کے لئے سب کچھ اپنی نگرانی میں کرواتیں۔ صبح پانچ بجے سے چاء کا پانی یوں رکھا جاتا کہ ایسا نہ ہو اس کی آنکھ کھلے اور تپائی پہ چائے تازی اور گرما گرم موجود نہ ہو سعید کے اٹھنے کا وقت مقرّر نہ تھا اور چائے کا پانی بہرحال کبھی جلد کھول جاتا تھا اور کبھی بنی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو جاتی تھی۔ یہ ایک ایسا دکھ بھرا مسئلہ تھا جو صبح کا بیشتر وقت صرف کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ناشتے کی فکر۔ ناشتے کی میز پہ تمام ایسی چیزوں کا مہیا کرنا جو گھر میں، نزدیک کے بازار میں اور ذہن میں بیک وقت آسکیں اور ان سب چیزوں کا بھی بالکل ٹھیک وقت پر تیار ہونا یعنی سعید کے تیار ہونے کے نہ ایک منٹ پہلے نہ چند سکینڈ بعد، اس کے لئے صبح کا زیادہ وقت یوں بھی اس کے آگے پیچھے پھرنے میں گزرتا کہ اس کی ہر نقل و حرکت سے آگاہی رہے اور اگر وہ کبھی کسی بھابی یا بھتیجے بھتیجی سے باتوں میں مشغول ہو جاتا تو فوراً اسے آگاہ کر دیا جاتا کہ ناشتہ تیار ہوا ہی چاہتا ہے اور وہ نہایت فرمانبرداری سے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر غسل خانہ کی راہ لیتا۔ پیار اور خیال کا یہ دامن سکڑتے سکڑتے اس حد تک پہنچا کہ اپنے وقت کے ساتھ سعید کے بھی سارے وقت کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ دفتر کے اوقات کے بعد وہ جو کچھ بھی کرتا اس میں اس کی مرضی کا دخل کم اور ماں کی مرضی کا دخل زیادہ ہوتا۔ سونا، ٹہلنا، دوسروں سے بات چیت کرنا، دوستوں اور عزیزوں کے ہاں جانا یہ تمام باتیں وہ اسے قدم قدم پہ سجھاتیں اور جس وقت اسے یہ احساس ہوا کہ یہ دامن گریباں بن کر اس کی گردن کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے تو بہت وقت بیت چکا تھا اور یہ احساس بھی ایک دم

یوں طلوع نہیں ہوا جیسے روزِ روشن کا آفتاب بلکہ اس طرح جیسے ابر آلود آسمان پر صبح نمودار ہو رہی ہو گویا ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ بس ایک اَن جانی بے چینی سی کہ اگر اس وقت لیٹنے کے بجائے تاش کھیلا جاتا تو! مگر نہیں، حکم تھا کہ تھکے ہو آرام کرو۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی بہتری کے لئے ہی کہا گیا تھا۔ چنانچہ اس نامعلوم سی بچگانہ خواہش کو جو اُسے کچھ کچھ احساسِ بغاوت سی معلوم ہوتی وہ دبا دیتا۔ اور یوں کروٹ بدلتے بدلتے اسے نیند آجاتی۔ اور پیار کا سمندر اسے آرام سے سوتا دیکھ کر خود بھی آنکھیں بند کر کے کچھ دیر کے لئے پُرسکون ہو جاتا۔ اس خیال کو اچھی طرح ذہن میں بٹھائے کہ شام کی چائے اس کی آنکھ کھلنے سے پہلے تیار ہونی چاہیئے۔ نیند یوں چاہے سولی پر بھی آجائے اور خواہ اس کی وجہ سے ضروری سے ضروری کام چھوٹ جاتے ہوں مگر اگر آپ کے دل کو لگی ہو تو نیند کی مجال نہیں کہ آپ کو بالکل غافل کر سکے۔ نیند تو نیند ہے دل کی قوت تو موت کو بھگا دیتی ہے چنانچہ آنکھ ہمیشہ عین وقت پر کھلتی اور شام کے دھندے انتہائی تکلف سے شروع ہو جاتے ایک مرتبہ چائے کا پانی کھول جاتا اور نیند نہ ٹوٹتی تو اسے منہ دھونے کے لئے لوٹے میں ڈال دیا جاتا۔ اگر اس مرتبہ بھی وہ بازی لے جاتا تو برتنوں کے لئے کسی دیگچی کی نذر ہو جاتا اور چا کے لئے پانی از سرِ نو رکھا جاتا کیونکہ انہیں معلوم ہوتا کہ چا صرف فوراً اُبلے ہوئے پانی کی بہترین ہوتی ہے۔ اور ابھی تیسری مرتبہ پانی رکھا ہی گیا ہوتا کہ معلوم ہوتا سعید نیند کی دیوی کی آغوش سے نکل کر جوتے پہن رہا ہے۔ یہ وقت انتہائی گھبراہٹ کا ہوتا، اپنی جلد بازی پر لعنت بھیجتے ہوئے آنچ اس قدر تیز کر دی جاتی کہ معلوم ہوتا آج بے چاری کیتلی ستی ہونے کا تہیّہ کئے ہوئے ہے۔ اور جس وقت چائے میز پر آتی تو وہ خود شکر ملا کر اس طرح اسے پیش کرتیں کہ اگر یوں نہ ہوتا تو جانے کیا ہو جاتا۔

کھانے کا وقت ایک عام اضطراب و بے چینی کا وقت ہوتا۔ ہر چیز صحیح اور درست حالت میں میز پر موجود ہو، گرم سے گرم روٹی ہو اور پھر یہ کہ لاپرواہی میں وہ گرم روٹی ہی لینا نہ بھول جائے۔ کہیں کوئی چیز اس کی نظر سے بچ نہ رہ گئی ہو۔ چیزوں کا کیا حال ہے اپنا دل تو ہوتا نہیں بے دل کی کٹھور چیزیں کہیں خود کو ادھر ادھر چھپا لیں اور وہ چکھنے سے محروم رہ جائے۔ اور اگر کبھی کوئی ایسا بدقسمت دن ہوتا کہ وہ کسی چیز کو چکھنے سے محروم رہ جاتا (اکثر اس وجہ سے کہ وہ چیز اسے پسند نہ ہوتی) اور کوئی بدلحاظ بچہ اس چیز کو مانگ بیٹھتا تو اس ایک دکھ سے ان کے آنسو نکل آتے۔ وہ صحیح معنوں میں، دو پٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہتیں، اس کی قسمت میں تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اس نے چکھا تک نہیں، سوچ رہی تھی کہ شام کے کھانے کے لئے رکھ دوں گی، مگر تم لوگ تو چیونٹیوں کی طرح چمٹ جاتے ہو ایک چیز سے۔ لو بس اور بھاگ جاؤ۔ وہ ایک ایک چمچہ ہر ایک کے حصے کا پلیٹ میں جھاڑتے ہوئے رخصت کرتیں۔ اور کمر بند میں بندھی ہوئی کنجی سے قفل کھول کر اسے اپنے خاص نعمت کدہ میں رکھ دیتیں اور اکثر یوں ہوتا کہ کوئی ایک آدھ ہفتے بعد وہ چیز جھوٹی پلیٹوں کے درمیان سڑی بسی حالت میں نوحہ کناں نظر آتی اور اماں کسی بہو سے کہتی۔ "چاہے چیز سڑ جائے پر کسی غریب کے پیٹ میں نہ پڑ جائے۔" دراصل انہیں غریب کے پیٹ میں پڑنے پر تو کوئی ایسا اعتراض نہ تھا، مگر وہ ایک خیال کہ شاید اس وقت دل نہ لے رہا ہو پھر کسی وقت کھالے مگر وہ ان سب احساسات سے یوں بے خبر تھا جیسے موجوں کے اضطراب سے ساحل کے سنگریزے۔ یوں تو نہ تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہ ہو کہ اماں اس کا خیال رکھتی ہیں یا نہیں، ہاں مگر وہ اس کی شدت کو نہ پا سکتا تھا کیونکہ وہ تو صرف الفاظ ہی سنتا تھا، اس کے پیچھے ٹھاٹھیں مارنے والا جذبات کا سمندر اسے

نظر نہ آتا تھا۔ شروع ہی سے ایسا کم بیں تھا وہ۔ کبھی کبھی ماں کے دل میں یہ خوف سر اٹھاتا تھا کہ شاید شادی کے بعد وہ بھی بدل جائے مگر وہ اس خیال کو جلد ہی نکال دیتی تھیں، بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو ازل سے ان کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ ہمیشہ سے اللہ میاں کی گلے۔ بڑے سب من مانی نہ کرتے تھے تب بھی ہٹ کے پکّے ضرور تھے۔ مگر سعید میں ان کو ایسی کوئی بات نظر نہ آتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ان کی بات مانتا تھا، نرا سعادت مندی کی پوٹ تھا وہ۔ کبھی کبھی چاؤ میں آکر وہ پوچھتیں۔ "بتا کہاں کرے گا بیاہ"

تو وہ بڑے اطمینان سے کہتا۔ "جہاں تم چاہو"

"خاندان میں تو اب میں کروں گی نہیں"۔ وہ کہتیں۔ اور جب دور دراز کی دیکھی بھالی دو ایک لڑکیوں کے نام لے کر وہ پوچھتیں تو بھی وہ یہی کہتا۔ "تم خود دیکھ لو جو تمہیں اچھی معلوم ہو۔" ایک تو یہی بات تھی جو اسے دوسرے بھائیوں سے الگ کرتی تھی۔ ہر چند کہ ان کی شادیاں انہوں نے ہی کی تھیں، مگر انتخاب میں وہ برابر بولتے تھے۔ اور انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ سعید کی دلہن تو وہ ایسی لائیں گی کہ ساری دنیا دیکھے گی اور وہ خود اُن کے انتخاب پر پھڑک اٹھے گا۔ انہوں نے کسی اپسرا کو اپنی دلہن کی حیثیت میں دل میں جگہ دے لی تھی۔ وہ سعید کی بیوی تھی مگر اس میں سعید کا زیادہ حصّہ نہ تھا، نہ ان کے آپس کے تعلقات کے ڈورے کچھ ایسے مضبوط تھے۔ ایک بے حد حسین، معصوم سی گڑیا۔ جس کو وہ سعید کے دامن سے یوں باندھ دیں گی، جیسے کوٹ میں بٹن ٹانک دیا۔ بٹن کی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے لیکن اہمیت دراصل کوٹ کی ہے یا پھر لگانے والے کی۔ بٹن تو بٹن ہی ہے، اس کا کام یہ ہے کہ جہاں لگا دیا جائے لگا رہے، تاوقتیکہ وہ ٹوٹ کر گر جائے یا کسی وجہ سے اس کو توڑنے کی ضرورت محسوس ہو۔ اسی اثناء میں جب وہ ایک خیالی حور کا نقشہ اپنے ذہن میں

بٹھانے کے بعد سوچ رہی تھیں کہ ایک ذرا فرصت ملے تو کسی دن جا کر شہر کے کسی خوبصورت بنگلے یا کوٹھی میں اسے تلاش کر کے انگوٹھی پہنا آئیں۔ سعید تھا کہ بے اختیار ندرت کی طرف یوں جھکتا جا رہا تھا جیسے یہ جھکنا اس کے اختیار سے باہر ہو۔ سعید کی ملتجیانہ نظروں، آہوں اور آنسوؤں کے طوفان میں وہ یوں ڈٹی کھڑی تھی کہ ذراسی جھونک بھی نہ کھاتی تھی۔ اس کے ہزار ہا سوالوں کے جواب میں وہ بڑے اطمینان سے کہتی۔ میں اپنی حیثیت نہیں بھولتی تم اپنا مقام کیوں بھول رہے ہو۔ اس ثابت قدمی نے سعید کے قدم بالکل ہی اکھاڑ پھینکے۔ اس نے ندرت کو اپنی طرف جھکانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُدھر ماں دلہن کے لئے لائے ہوئے بغیر سلے کپڑوں پر صبح شام پیار سے ہاتھ پھیر کر ایک صندوق سے دوسرے صندوق میں یوں منتقل کر دیا کرتی تھیں جیسے پرانے زمانے کے بادشاہ اپنے بیش بہا ہیروں کو بچانے کے لئے ہر رات سونے کی جگہ بدل لیا کرتے تھے۔ کہیں چوری کا اندیشہ تھا کہیں ٹپکے کا کہیں مسالحہ سیاہ پڑنے کا خطرہ تھا، کہیں جگہ کی کمی کے باعث دیرپا شکنیں پڑنے کا ڈر۔

اور جب ندرت نے نامعلوم اس عشق بلاخیز سے اکتا کر یا کچھ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سعید کی نظروں کی پذیرائی کی اور دل کی روایتی کلی پھول بننے لگی تو اس کے جذبۂ انانیت نے خالص مردانہ انداز میں سر اٹھایا۔ نظروں پر پہرے، آنے جانے کے وقت کا محاسبہ، رشتہ دار لڑکوں سے بات چیت کی باز پرس، وقت بے وقت اسکول چھوڑ آنے کی پیش کش تو ایک دن ندرت نے بڑے تیکھے انداز میں اس سے کہا۔ میں روز روز کے یہ سوال و جواب نہ سہہ سکوں گی، اگر مکمل اعتماد نہ کر سکو تو میرا راستہ جدا تمہارا الگ، ابھی تو وہ ملازمت چھوڑ دینے کی اصل بات بھی زبان پہ نہ لایا تھا اور کئی کھٹکے بھی دل سے نکال لئے تھے کہ یہ ضرب پڑی اور کاری،

بالکل دُکھتی رگ پر۔ بہت کہا، جانِ من محبت میں رشک لازمی اور شک جائز ہے۔ بھنویں سکیڑ کر فرمایا۔ "ہوگا، مجھے ایسی محبت نہیں چاہیئے۔" اور یوں وہ خلیج جو ٹیڑھی ترچھی نظروں کے شہتیروں سے پاٹی جا رہی تھی جوں کی توں رہ گئی۔ پوری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی چیز بے مانگے بھی نہ ملے اور طلب کرنے پر بھی نہیں۔ ایک ایسی پھانس سی دل میں لگ گئی کہ نہ نکالے ہی بنتی تھی نہ اپنی جگہ پر رہنے دیا جا سکتا تھا۔ اور اُدھر وہی اندازِ تمکنت، وہی چال ڈھال، وہی اوقات، کیا مجال جو کسی بات میں کوئی فرق آیا ہو، دل ہے یا پتھر! سعید میاں اٹوائی کھٹوائی لے پڑ گئے۔ جی خراب ہے، مگر کیا گھر بھر میں کسی کو خبر نہیں۔ ڈاکٹری دوائیں بھی ہو رہی ہیں، حکیموں کے نسخے بھی، کچھ اپنے ٹونے ٹوٹکے بھی۔ نظر بھی اتاری جا رہی ہے مگر وہ ہے کہ خاموش صورت تصویر۔ رنگت زرد اندر ہی اندر گھلا جا رہا ہے۔ ماں کی جان پر بنی ہے۔ ایک لمحہ نظروں سے اوجھل کرنا بھی مشکل اور اس کا سب کام اپنے دستِ خاص سے کرنا بھی لازمی۔ نتیجہ یہ کہ ایک پاؤں باورچی خانے میں ہے ایک سعید کے کمرے میں۔ کہاں کی نیند کہاں کا آرام۔ ندرت اسکول آتے جاتے بڑی بے نیازی مگر بظاہر پورے خلوص سے اس کی طبیعت پوچھ جاتی۔ ایسے وقت سعید کچھ بہت بے چین سا نظر آتا۔ گویا کم وقت میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہو۔ ٹوٹے پھوٹے جملے، ماں کے آنے پر یکلخت خاموشی اور الجھی الجھی نظریں ماں سے کس طرح چھپی رہتیں۔ شبہ ہو ہی گیا۔ ہو نہ ہو دال میں کالا ہے۔ شاید ڈورے ڈال رہی ہیں۔ صاحبزادی! شام کے جھٹپٹے میں جب یہ روشنی کرنے اندر آئیں تو دیکھا کہ سعید نے ندرت کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر وہ سر سے نکل گئی۔ یہ دل تھام کر بیٹھ گئیں۔ اللہ غنی! یہ عالم دودھ نہیں بخشوں گی، اگر موری کی اینٹ کو چوبارے پر چڑھانے کا ارادہ کیا، اینٹ موری کی تو نہ تھی مگر اپنے نئے جان پہچان والوں سے یہ کہتے کہتے کہ ایسی ہی ایک دور کے رشتے کی لاوارث

بچّی ہے کچھ وہ اسے یہی سمجھنے لگی تھیں۔ دل جب ذرا قابو میں آیا تو بیٹے سے پوچھا۔
"کیا کہہ رہا تھا تو ندرت سے" سعید نے ٹالنے کی کوشش کی مگر کچھ زبان کی لکنت،
کچھ چہرے کی رنگت کہہ گئی۔ ہاں نہ کہہ سکا تو نہ کہتے بھی نہ بنی۔ ماں کے کان کھڑے
ہوئے، وہ دل ہی دل میں بے زبان الپسرا کو آواز دینے لگیں کہ مدد کو آئے۔ تلاش
میں بھی کچھ وقت لگتا ہے۔ بلا سے وہ نہ ملے کچھ تو ہو یہ تو نہیں، کہ جو بچے ہی میں
گر پڑے بالکل۔

سعید کا دھیان بٹانے کی تدبیریں شروع ہوئیں۔ دوستوں سے کہلوا دیا گیا کہ سعید
بیمار ہے اس کا دل گھبراتا ہے گھڑی دو گھڑی آ کر اس کے پاس بیٹھ جایا کریں۔ ریڈیو
اس کے سرہانے رکھ دیا گیا۔ شام کا بیشتر وقت وہ خود کمرے میں گزارتیں اور جس وقت
ندرت اندر داخل ہوتی اس پر کڑی نظر رکھتیں کہ ایسی باتیں تو نگاہوں ہی نگاہوں میں
کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہیں۔ اکثر وہ اسے کاموں میں الجھا دیتیں۔ سعید کی دوا کا وقت
ہو گیا ہے، ایک گلاس میں پانی لے آ۔ یا ذرا دیکھو کمبخت ماما کیا کر رہی ہے، کہیں
سوپ کا پانی بالکل ہی خشک نہ ہو جائے۔ وہ چلی جاتی تو اکثر واپس بھی نہ آتی اور
وہ سکھ کا سانس لیتیں۔ بیٹے کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی ہیں یہ بھی ان سے چھپا
نہ تھا یہ سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ سوچتیں نفاست تو ان میں نام کو نہیں
ہوتی۔ عورتیں بھوکی مر جائیں گی۔ مگر سڑی بسی خراب خستہ چیز پر نظر نہ ڈالیں گی مگر ان
کے لئے بھوک میں سب کچھ روا ہے۔ فطرت ہی ایسی ہے کم بختوں کی۔ اس کی طبیعت
ذرا سنبھلے تو وہ دل جما کر لڑکی کی تلاش کر ہی ڈالیں۔ مگر جب اس کی طبیعت ذرا
سنبھلی تو ان کے لئے الجھن اور بڑھی۔ اسکول جاتے وقت دیکھا کہ پھاٹک میں سے
نکلتے نکلتے نہ معلوم کیا باتیں ہو گئیں۔ واپسی کا وقت ہے تو بھی صاحبزادے وہیں
جمے ہوئے ہیں۔ مگر ایک بات ضرور تھی جب وہ بلاتیں تو فوراً آ جاتا۔ تعمیلِ حکم میں تکلف

کا اظہار ہوتا تو چہرے سے. مگر آنا کانی کبھی نہیں کی۔ یہ دیکھ کر انہیں اطمینان ہوتا. وقت آئے گا تو میرا کہا مان لے گا ایسا تھوڑا ہی ہے۔ لیکن ایسی حالت میں دل جما کر تلاش ذرا مشکل تھی. جب تک گھر کی طرف سے بے فکری نہ ہو' انہوں نے سوچا لڑکے ذات پر سختی ٹھیک نہیں نہ معلوم کس وقت کیا کہہ جائے چنانچہ انہوں نے ذرا ندرت کو دبانا شروع کیا۔ ذرا ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پوچھتیں "سعید کیا کہہ رہا تھا تجھ سے ہے" اور کس معصومیت سے وہ بھنویں چڑھا کر گویا یاد کرتی. "شاید رات کے ریڈیو ڈرامے کا ذکر کر رہے تھے کچھ ہے"

"اور اس وقت وہاں برآمدے سے نکلتے ہوئے ہے" وہ اپنی نظروں کو تھوڑا سا اور تلخ بنائیں۔ "وہ مجھ سے انگریزی کے ایک لفظ کا تلفظ پوچھ رہے تھے"۔ ہونہہ، کہہ کر وہ جلتی نظروں کے تیر پھینکتیں گویا کہہ رہی ہوں. "سب سمجھتی ہوں میں ۔"

مگر وہاں نہ اضطراب نہ تشویش کہ یہ سب کیا ہے جیسے یوں ہے تو چلو یوں ہی سہی ۔

اس کی ادا انہیں جتنا بھی نہ جلاتی کم تھا. مگر اب ایسی خود سر اور بے غیرت لڑکی کو وہ کہیں بھی کیا. صاف ان کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی ۔ اور اس رات جو ان کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہیں کہ ندرت اپنے بستر پر سے غائب ہے۔ اٹھ کر دبے پاؤں وہ چلیں۔ برآمدے ہی میں مڈھ بھیڑ ہو گئی ۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔

"کہاں گئی تھی ہے" ایک ایک لفظ میں زہر کی ایک پوٹ تھی۔ جسے چھپانے کی انہوں نے کوئی ضرورت نہ سمجھی تھی۔

"سعید کے پاس"۔ ندرت نے اطمینان سے کہا۔ انہیں تو یہ خیال تھا کہ جو بھی بہانہ وہ بنائے گی وہ منہ چڑھا کر اس کا راز فاش کر دے گا کہ کہاں وہ پورے اطمینان

سے کہتی ہے "سعید کے پاس"۔

غصّے سے وہ دیوانی ہوگئیں۔

"کیوں گئی تھی تو وہاں بتا ہے" کہہ کر اس کی طرف لپکیں، وہ ایک طرف سرک گئی۔ ہلکی ہلکی چاندنی برآمدے میں آرہی تھی۔ غصّے میں ان کا سراپا کسی بھوت سے کم نہ تھا۔

"آپ سعید سے پوچھ لیں۔"

"اس سے تو پوچھوں گی ہی تو بتا تیرا کیا کام تھا وہاں کمبخت، آوارہ بدنصیب"، وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ اور وہ ان کے راستے سے الگ ہوکر بکمال اطمینان اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔ وہ دو قدم اس کے پیچھے لپکیں اور اس کو اپنی گرفت سے دور دیکھ کر انہوں نے اپنا سینہ کوٹ لیا اور اس طرح بَین کرنے لگیں جیسے ان کا بیٹا خدانخواستہ جوانا مرگ ہوگیا ہو۔ گھر کا گھر جاگ اٹھا۔ سب ان کے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ گالیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے مگر نشانہ کون ہے پتہ نہیں چلتا۔ سب سے اخیر میں آنے والا سعید تھا۔ "کیا ہوا اماں ہے" اس نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

"چل دور ہو میری نظروں سے بے غیرت، مجھ سے تیری حرکتیں چھپی ہیں جو لیں بھولا بن رہا ہے۔"

"اماں کیا کہہ رہی ہو تم؟" وہ نزدیک آکر بولا۔ اور تڑاق تڑاق کئی تھپیڑ اس کے سر اور چہرے پر یوں برس گئے کہ پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو بچانے کا ہوش بھی نہ رہا۔ خود سعید کچھ دیر کو تو بھونچکا سا رہ گیا۔ پھر تڑپ کر بولا۔ "اماں تمہیں کیا ہوا ہے کس خطا پہ مار رہی ہو مجھے۔ کچھ پتہ تو چلے۔"

"تو کیوں میری آہ سمیٹ رہا ہے، کیوں میری زبان کھلوا رہا ہے؟" وہ چیختے ہوئے بولیں۔ "اگر تو اتنا ہی بھولا ہے تو کیوں گئی تھی وہ حرّافہ تیرے پاس ہے"

"کون ہے"

"وہ تیری کچھ لگتی ندرت اور کون ہے"

آس پاس کھڑے ہوئے بیٹوں اور بہوؤں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"ندرت میرے پاس نہیں آئی"۔ سعید نے آواز کو پُر یقین بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بول لے جھوٹ اگر بول سکتا ہے۔ جو کچھ چاہے کہہ لے مگر تیرے پاس اس کا بھی کوئی جواب ہے کہ خود اس نے مجھ سے کہا ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا تاکہ اس جملے کا ردِ عمل دیکھ سکیں۔ اسے خاموش دیکھ کر وہ اوروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں "آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہیں کمبخت۔ چوری اور سینہ زوری۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے گھر کو یوں آگ لگے گی"۔

"کیا معاملہ ہے؟" بڑے بھائی نے آہستہ سے رازدارانہ لہجے میں سعید سے پوچھا۔

"اماں کو غلط فہمی ہوئی ہے بھائی صاحب، ندرت میرے پاس نہیں آئی، اماں کے رونے چلّانے سے میری آنکھ کھلی ہے تو میں یہاں آیا ہوں۔"

"اور وہ جو تیری لاڈلی قبول گئی ہے اسے تو سکھا لیا ہوتا پہلے"۔

"ندرت یہ کیسے کہہ سکتی ہے۔ آج دو دن سے میری اور اس کی ایک بات بھی نہیں ہوئی"، بھابیاں بے یقینی سے مسکرائیں، بھائی گھبراہٹ میں سر کھجانے لگے۔ یہ قصّہ کیا ہے۔ اماں ابھی تک خود پر قابو نہ پا سکی تھیں اور آنسوؤں کے ریلے کے ساتھ بہے جا رہی تھیں۔ باپ تو اٹھ کر ہی نہ آئے۔ کمرے میں پڑے پڑے انہیں پتہ چل گیا تھا کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔ بہوؤں اور بیٹیوں کے مجمع میں وہ ایسی بات میں کیا کہیں گے۔ یہ سوچ کر ہی انہیں پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ دادا ابا اپنی لاٹھی ٹیکتے

ہوئے آئے اور بولے: "دلہن کیا معاملہ ہے؟"

دلہن نے جو اس وقت کچھ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھیں، من وعن سارا واقعہ سسر کو دو ایک شریف قسم کی گالیوں کے اضافے کے ساتھ سنا دیا۔

"ہونہہ — ہونہہ —" وہ سنتے میں یوں سر ہلاتے جاتے تھے جیسے حکیم صاحبان مریض کا حال سن کر سر ہلاتے ہیں۔ سارا قصہ سن کر سعید کو ذرا ایک طرف لے جا کر انہوں نے اس سے پوچھا۔

"سچ سچ بتا دے وہ تیرے پاس آئی تھی۔ جوانی میں بچوں سے اکثر غلطی ہو جاتی ہے کوئی ایسی بات نہیں۔"

بہوویں دو قدم سرک سرک کر دادا ابا کے عین پیچھے دبک گئیں۔ لڑکوں کی نظریں سعید پر جمی تھیں۔

"دادا ابا قسم قرآن کی کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"اور آج؟"

"آج بھی نہیں۔"

"ہونہہ ——" دادا ابا نے کہا۔ "ندرت کو بلاؤ۔"

اب ندرت کو کون اس بھری عدالت میں لاتا۔

"ندرت کو بلاؤ۔" دادا ابا نے دوبارہ کہا۔

چھوٹی بھاوج نے جا کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ بھاوج کی نظریں یوں نیچی تھیں جیسے گناہ انہوں نے ہی کیا ہو۔ ندرت کی گردن تنی ہوئی تھی۔ اور پلکیں بھی نیچی نہ تھیں۔ وہ عدالت کے کمرے میں بھابی سے پہلے داخل ہوئی اور ایک میز پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم سعید کے پاس گئی تھیں؟" دادا ابا نے پوچھا جو اپنے زمانے میں مشہور وکیل

... ہے بیٹے۔

"جی نہیں۔" ندرت نے اطمینان سے کہا۔

مارے حیرت کے دادا ابا کچھ اچھل سے پڑے۔ بڑے بھائیوں کی آنکھیں اس ڈرامائی سین کو دیکھ کر پھٹ گئیں۔ اماں بھی اس وقت دم بخود تھیں۔

"تم نے کہا تھا کہ تم سعید کے پاس گئی تھیں؟" دادا ابا نے دوسرا سوال پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تم کہاں گئی تھیں؟"

"پانی پینے۔"

"پھر تم نے یہ کیوں نہیں کہا!"

"اس لئے کہ اگر میں کہتی تو ممانی میرا اعتبار نہیں کرتیں وہ وہی سمجھتیں اور مجھے ہر وقت طعنے تشنے اور کچوکے دیتی رہتیں۔ وہ سعید سے نہ پوچھتیں اور مجھے ہر ایک کی نظر میں ذلیل کئے جاتیں۔"

"لیکن جو بات تم نے کہی اس میں ذلت کی کوئی بات نہیں تھی؟" دادا ابا نے پوچھا۔

"میں نے یہ اس لئے کہا تھا کہ بات صاف ہو جائے اور پھوپھی اماں مجھے گول مول چبھتے ہوئے فقرے دل میں کچھ نہ کہتی رہیں۔" اور دفعتاً اس کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا اور اس نے بغیر کسی کی طرف دیکھے کہا۔ "میں آپ سب لوگوں کے سامنے بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے سعید سے کوئی دلچسپی نہیں۔" اور کمرے میں سے نکلتے نکلتے وہ کہہ گئی۔

"ممانی یہ غلط فہمی اپنے دل سے نکال دیں۔ ویسے وہ چاہیں تو میں اس گھر سے جانے کو بھی تیار ہوں۔"

دادا ابا سے لے کر سب سے چھوٹی بھاوج تک سب ہکا بکا رہ گئے۔ یہ لڑکی ہے یا چھلاوہ بات کو منٹ بھر میں کیا سے کیا کر گئی۔ اماں سمیت سب کا منہ

دیکھنے لگیں۔ کوئی تو کہے کہ جھوٹ بولتی ہے بدذات، جب سن لیا کہ سعید مُکر گیا ہے تو بات بنا ڈالی۔ مگر اوّل تو ان کو معلوم تھا کہ ندرت اپنے کمرے میں تھی، جو بالکل پرلے سرے پر تھا جہاں سعید کی بات نہ پہنچ سکتی تھی۔ دوسرے جس اطمینان، خودسری اور خودنمائی سے وہ بھرے مجمع میں یہ بات کہہ گئی۔ کیا دل میں چور ہونے پر ایسی بات کہہ سکتی تھی، ناممکن۔ دوسروں کے علاوہ خود اماں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ گئی تھی شاید ٹھیک ہی ہے۔ تو یوں وہ انہیں چوٹ دے گئی۔ اُف، یہ آج کل کی لڑکیاں ان کی ہمتیں تو دیکھو۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ کسی لڑکے کا ذکر یونہی ہمارے نام کے ساتھ آ جاتا تھا تو تھر تھر کانپنے لگتی تھیں۔ اور ایک یہ زمانہ ہے کہ وہ دس مردوں کے درمیان کہہ گئی کہ ہاں میں نے ایسی بات کہی تھی۔ اماں! مجھے اکیلے میں طعنے نہ دیں۔ کیا ایسی بات بھی کسی لڑکی کی زبان سے نکل سکتی ہے۔

"جاؤ بچو! آرام کرو تم لوگ۔" دادا ابا نے کہا۔

ایک ایک کر کے سب کھسک گئے۔ سعید جانے سے پہلے ٹھٹکا کہ شاید دادا ابا اس مقدمہ کا کوئی فیصلہ سنائیں۔ مگر انہوں نے کچھ نہ کہا۔ جب سب کے قدموں کی چاپ ختم ہو گئی اور ان کی پرچھائیاں بند دروازوں کے پیچھے ڈوب گئیں تو دادا دلہن سے مخاطب ہوئے۔

"تمہیں ندرت سے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں دلہن۔ وہ بچی نہیں ہے اور ویسے بھی آج کل کے تو بچے بھی پہلے کی بہ نسبت بہت سمجھ دار ہیں۔"

بہو مارے شرم اور غصے کے کٹ گئیں۔ سارا زمانہ اپنے زمانے کی تعریف کرتا ہے مگر یہ بڑے میاں مارے فیشن کے جب دیکھو نئے زمانے کے قصیدے پڑھتے نظر آتے ہیں۔ جھنجھلا کر بولیں "کیا بات کرتے ہیں ابا آپ، جب اس نے خود اپنی زبان سے کہا تو پھر بھی یقین نہیں کرتے ہیں۔"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے دُلہن۔ مگر اس نے ایسی بات کہی ہی کیوں، تمہیں اس پر اتنا شک نہیں کرنا چاہیئے۔"

"وہ چپ ہو گئیں۔ پھر ڈرتے ڈرتے انہوں نے یہ بات پوچھ ہی لی۔" کیا ندرت اور سعید نے جو کچھ کہا آپ کو اس کا یقین آگیا۔"

"ہاں" انہوں نے بڑے یقین سے کہا اور کچھ دیر سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ بولے۔

"اور دیکھو دلہن۔ سعید سے پوچھ لو، اگر اس کی خوشی ہو تو دونوں کی شادی کر ڈالو۔ کیا حرج ہے!"

وہ چونک پڑیں۔ بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں کچھ۔ بھلا ان دونوں نے کہا اس کا بھی یقین ہے۔ اور ساتھ ہی فرما رہے ہیں ان کی شادی کر ڈالو۔ سچ ہے آدمی لاکھ دانا اور با دماغ کیوں نہ ہو عمر اس پر اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ آخر ای کے پیٹے میں ہیں اب۔

بہو کو یوں اپنی طرف تذبذب کے عالم میں دیکھتے دیکھ کر وہ بولے "اچھا تم رہنے دو میں خود ہی بات کر لوں گا سعید سے اور تمہیں بتا دوں گا۔ جاؤ اب تم بھی جا کر سوؤ۔ ہاں اختر سے کچھ ذکر نہ کرنا۔ اس آج کے جھگڑے کا خواہ مخواہ اس کا دماغ پریشان ہو گا۔" اور وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔

"سب کمبخت مجھی کو احمق بناتے ہیں۔" انہوں نے تلخی سے سوچا اور جا کر چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔

"کیا ہوا ہے" میاں کی سرگوشی سنائی دی مگر وہ کچھ نہ بولیں۔ یہ بھی کچھ میری مخالفت ہی میں بولیں گے۔ نہ معلوم کیا ہو گیا ہے ان سب لوگوں کو۔ بزرگوں نے یہ بے حیائی لادلی ہے ابھی نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ کھلے خزانے سب کچھ کرتے ہیں اور پھر مکرتے ہیں۔

دوسرے دن جب وہ سعید کے لئے خاص طور سے قیمہ بھرے کریلے تیار کر رہی تھیں دادا ابا منّو کے ہاتھ میں اسٹول اٹھوائے آئے اور ان کے پاس بیٹھ گئے۔ منّو کے جاتے ہی بغیر تمہید کے انہوں نے کہا۔

"میں نے سعید سے بات کر لی ہے، وہ ندرت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اختر سے بھی میں نے ذکر کیا تھا اس کو بھی کوئی اعتراض نہیں"۔ وہ کھنکارے "میرا خیال ہے کہ یہ رشتہ ہو جائے تو اچھا ہے۔ تم تیاری کر ڈالو، گھر کی لڑکیاں اچھی رہتی ہیں"۔

پورا فیصلہ سنا دیا انہوں نے۔ کہنے سننے کی کچھ گنجائش ہی نہیں ہے گویا، یعنی وہ تو کچھ ہوئی ہی نہیں۔ لڑکا لڑکی تیار ہیں۔ باپ اور دادا راضی ہیں۔ بس اور کیا چاہیئے۔ اُن کو غصہ آ گیا۔ "نکاح پڑھا آتے اور مجھے اطلاع دے دیتے"۔ یہ بات ان کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ غصے میں وہ ایک کریلے پر کئی گز دھاگا فالتو لپیٹتی ہی چلی گئیں۔ تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کمبخت کلموئی نے سعید کو ان سے چھین لیا۔ دوسروں کی نظر میں ستیا جی بنی رہی وہ الگ اور مجھے احمق بنایا سو جدا۔ پھر غضب یہ کہ ان میں سے کوئی ان مکر بازیوں کو سمجھتا بھی تو نہیں۔

دوپٹے سے آنسو پونچھتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ بہو کے دل کو ٹھیس لگی ہے۔ وہ بہت دیر تک ان کو سمجھاتے رہے "ہو سکتا ہے باہر اس سے اچھی لڑکی مل جائے۔ صورت کی بھی اچھی ہو، امیر بھی ہو مگر جب لڑکے کا دل نہ لے تو یہ شادی کچھ ٹھیک نہیں۔ اپنا بچہ جلتے انگارے کی طرف ہاتھ بڑھائے تو ایک دفعہ کو تو دل چاہتا ہے کہ وہ بھی دے دیں۔ پھر اس لڑکی میں تو خدا جانتا ہے کچھ عیب بھی نہیں، تم خود سوچو"۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئے اور وہ بہت دیر تک دوپٹے سے اپنی آنکھیں مع ناک کے صاف کرتی رہیں۔

چند دن تک وہ سعید سے کھنچی کھنچی رہیں۔ چہرے پر قدرے ترشی کے آثار،

گفتگو بہت مختصر سی اور بلا ضرورت ایک بات بھی نہیں لیکن اس کے خیال اور آرام میں کوئی کمی نہیں کی۔ پھر رفتہ رفتہ ان کا غصہ زائل ہونے لگا۔ آج تک انہوں نے سعید کی کوئی بات نہیں ٹالی تھی نہ کسی اور کو ٹالنے دی تھی۔ خواہ اس کی خاطر انہیں دوسروں سے کتنا ہی لڑنا پڑا ہو۔ اب اس کا سوکھا سا منہ اور بے نور خشک آنکھیں دیکھ کر ان کا کلیجہ کٹنے لگتا تھا۔ اس کے لئے تو وہ آسمان کے تارے بھی توڑ لاتیں، اور وہ تو ایسی چیز طلب کر رہا تھا جو گھر میں تھی۔ اتنی معمولی جیسے گھر میں مدتوں کی پڑی ہوئی زنگ خوردہ کیل۔ کیا اتنی سی چیز کے لئے وہ اس کا دل توڑ دیں۔ بالآخر انہوں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ سعید کی خاطر، صرف اس کی خاطر وہ اس کلموئی کو بھی برداشت کر لیں گی۔ اتنے دن سے بھی تو وہ آخر ان کے سینے پر مونگ دل رہی تھی۔ شاید سعید اسے کچھ راہ راست پر لے آئے۔ ہاں وہ اسے ضرور سیدھا کر لے گا۔ جب وہ خود اتنا سعادت مند ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی طرح دے جائے کسی بات میں، اور پھر کمبخت رشتہ بھی تو ہے، وہ بھی تو آڑے آہی جاتا ہے ایسے وقت۔ یہ سب سوچ کر انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو تسلی دی اور بیٹے کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ سعید نے بے اختیار ماں کے ہاتھ تھام لئے۔ "اماں تم کتنی اچھی ہو۔ میں جانتا تھا کہ تمہارا دل کبھی نہیں مانے گا۔ اماں تم دیکھو گی کہ ندرت تمہاری سب بہوؤں میں سب سے زیادہ اطاعت گزار ہوگی، تم اس سے بہت خوش رہو گی۔"

"ہاں نہیں تو اور کیا ——" آنسوؤں کے ریلے میں ان کی آواز رندھ گئی۔ اس کی خاطر تو وہ عرش کے تارے بھی توڑ لاتیں، ندرت تو چیز ہی کیا تھی۔ افسوس اسی بات کا تھا کہ اس نے کسی چیز کی فرمائش ہی نہیں کی۔

اس دن وہ سعید اور دونوں بڑی بہوؤں کو لے کر ندرت کے لئے منگنی کا جوڑا

اور انگوٹھی لینے گئیں۔ بڑے بیٹے دفتر گئے ہوئے تھے۔ ایک بہو اپنے میکے میں تھی۔ صرف دادا ابا اپنے کمرے میں پڑے اونگھ رہے تھے۔ کچھ سوتے کچھ جاگتے میں انہوں نے تانگے کی آواز سنی اور یہ سوچ کر کہ شاید دلہن آگئیں پھر اونگھ گئے۔ لیکن خاصی دیر بعد جب انہوں نے اٹھ کر سارے گھر کا چکر لگایا تو معلوم ہوا کہ ابھی تو کوئی نہیں آیا۔ یونہی سڑک پر کوئی تانگہ گزرا ہوگا اس وقت۔ یہ سوچ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایسے خاص موقعوں کے لئے عورتیں بازار جائیں اور جلد لوٹ آئیں یہ کیسے ممکن ہے۔ یہ تو ان کی ساری عمر کا تجربہ تھا کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔

جس وقت بازار سے واپس آکر سعید خوشی میں گنگناتے ہوئے اپنے جوتے کا تسمہ کھول رہا تھا تو اسے اپنی میز پر پیپر ویٹ کے نیچے کوئی کاغذ اہتمام سے رکھا نظر آیا۔ جوتوں کو ادھ کھلا چھوڑ کر اس نے وہ کاغذ اٹھا لیا۔ ندرت نے لکھا تھا۔

سعید!

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ جو گھناؤنا الزام مجھ پر اس دن لگایا جا رہا تھا اس کو اٹھا کر اپنی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے چسپاں کر لوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا، معافی چاہتی ہوں۔ میں نے اپنے رہنے کا انتظام اسکول میں کر لیا ہے۔ سب سے سلام کہنا۔ خدا حافظ!

(ندرت)

سعید لمحہ بھر کو سناٹے میں آگیا۔ اس لڑکی کا دماغ کیسی عجیب باتیں سوچتا ہے۔ وہ تو مطمئن تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب جب کہ بزرگوں کی طرف سے تحریک ہوئی ہے ندرت کو بھی کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اتنے دن سے اسے بھی خوب معلوم تھا کہ گھر میں کیا چرچا ہو رہا ہے۔ وہ چاہتی تو کسی وقت منع کر سکتی تھی مگر اسے یہ ڈرامائی انداز نہ جانے کیوں پسند تھا۔ اس رات بھی وہ یونہی خالص ڈرامائی انداز سے سب کو اچنبھے میں ڈال کر چلی گئی تھی۔ اس کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی۔ سعید کو

یاد آیا اماں بتاتی تھیں کہ ندرت کی ولادت ریل گاڑی میں ہوئی تھی۔ ستم ظریف پیدائش ہی سے ایسی تھی گویا کوئی نئی بات کرنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ شاید یہ عادت اسے ورثے میں ملے ہو۔ کیونکہ اس کی ماں بھی انوکھی فطرت کی مالک تھیں۔ انہوں نے سب کی مرضی کے خلاف ایک ایسے شخص سے شادی کی تھی جو خاصا بدصورت تھا۔ اور پھر مارے جدت کے انہوں نے اپنی لڑکی کا نام سب کی مخالفت کے باوجود ندرت رکھا۔ اور پھر ایک دن نہایت ڈرامائی انداز میں غسل خانے میں نہاتے نہاتے کوئلوں کے گیس سے گھٹ کر مر گئی تھیں۔ اور اب ندرت اسم بامسمیٰ بننے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے بھی کئی روایات کو توڑا تھا۔ اور اب یہ نئی حرکت کہ ایک پرزے پر دو سطریں لکھ کر مزے سے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ سعید نے پرچہ دوبارہ پڑھا۔ ”جو گھناؤنا الزام اس دن مجھ پر لگایا جا رہا تھا اس کو اٹھا کر اپنی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے چسپاں کر لوں۔“ سعید کو یاد آیا کہ یہ الزام سب سے پہلے اس نے خود ہی لگایا تھا۔ اور دفعتاً اس نے یوں سانس روک لیا جیسے اس سے کوئی بہت بڑی بھول ہوگئی ہو۔ ہاں اس رات اس سے واقعی بھول ہوگئی۔ اگر وہ سب کے سامنے کہہ دیتا کہ ندرت واقعی اس کے پاس آئی تھی۔ پھر وہ اس الزام سے کیونکر بچتی جسے اس نے خود اپنے اوپر تھوپا تھا۔ اور پھر وہ اس آسانی سے مجھے چھوڑ کر بھی نہ جا سکتی۔ پھر تو اسے میرا سہارا لینا ہی پڑتا۔ اس خود تراشیدہ الزام کو اپنی پیشانی پر چسپاں کرنا ہی پڑتا۔ کاش اس وقت اس کو خیال آجاتا تو وہ یہ جوا بھی کھیل جاتا۔ اسے تصور میں وہ عدالت نظر آئی جہاں وہ سب موجود تھے اور دادا ابا جج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر وہ کہہ دیتا ہاں ندرت میرے پاس آئی تھی تو اس کے سامنے ندرت کا یکلخت پریشان ہو جانے والا زرد چہرہ گھوم گیا۔ وہ مجھے کیسی لجاجت بھری نظروں سے دیکھتی، اس خیال ہی سے اس کو ذہنی لذت سی

محسوس ہونے لگی لیکن فوراً ہی اس کے ذہن نے جھٹکا کھایا اور اسے یاد آیا کہ وہ وقت تو گذر چکا ہے اور وہ اسے نہایت آسانی سے ٹھکرا کر جا چکی ہے، اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شاید زندگی میں یہ پہلی چیز تھی جسے وہ یوں آسانی سے حاصل نہ کر سکا۔ جسے اس کی ماں بھی اُسے نہ دلا سکی۔ اُسے پھر اماں کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اماں نے اس کے ہاتھ سے لے کر پرچہ پڑھا اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ "نمک حرام کمبخت" وہ واقعی غصّے میں کھولنے لگیں۔ جس کو انہوں نے صرف سعید کی خاطر بمشکل قبول کیا تھا۔ وہ ان دونوں کو یوں نظر انداز کر کے چلی جائے گی اس کا تو کبھی تصور بھی نہ کر سکتی تھیں وہ۔ یہ لڑکی شروع سے ہی ایسی ناقابلِ برداشت تھی بالکل اپنی ماں کی طرح سنتے تھے قیامت نزدیک آجائے گی تو لڑکیاں اپنے منہ سے بر مانگیں گی۔ لیکن یہ تو اندھیر ہے کہ لڑکیاں منہ ملائے بردں کو یوں دن دہاڑے ٹھکرا کر گھر سے نکل کھڑی ہوں۔ انہوں نے تلخی سے سوچا یہ تو قربِ قیامت بھی نہیں کچھ پس قیامت کا سا سماں نظر آرہا تھا انہیں۔ اور یکایک وہ یوں رو پڑیں جیسے سخت دھوپ میں کوئی بڑی پرانی شزادہ مجزادہ برس پڑے۔ کیا کوئی ہستی ایسی سخت اور کٹھور بھی ہو سکتی ہے جو سعید کو۔ اُن کے سعید کو ٹھکرا دے۔ یہ تو کمبخت بے دل کی ان چیزوں سے سخت دل نکلی جو میز پر اس کی نظروں سے چھپ جاتی تھیں۔ اس کو تو وہ اپنے نعمت خانہ میں بھی نہیں رکھ سکتی تھیں کہ وقت بے وقت اس کے آگے رکھ سکیں۔ غصّے کی رَو ذرا دھیمی پڑی تو نیم فاتحانہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر دوڑ گئی۔ تو وہ اسے اپنی بہو بنانا کبھی کب چاہتی تھیں۔ ایک خوبصورت، انجان، مگر عرصے سے ان کے تصوّر میں بسا ہوا چہرہ ان کی نظروں میں گھوم گیا۔ ان کی بہو تو یہ ہے انہوں نے ہی غلطی کی تھی جو ندرت کو اس کی جگہ دینے کی کوشش کی تھی۔ اور جب انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ حسین چہرہ دکھانے کے لئے سعید کی طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھا، نہ معلوم وہ کس

وقت چلا گیا تھا۔ وہ اس کا انتظار کرتی رہیں، وہ ان کو بغیر اطلاع کئے شاید ہی کہیں جاتا ہو، لیکن وہ آج کیوں چلا گیا۔ فکر انہیں یہ تھی کہ کہیں اسی نامراد کو بہلانے پھسلانے نہ گیا ہو۔ انتظار کے یہ لمحات بڑے کٹھن تھے۔ کئی مرتبہ دل چاہا کسی سے کہیں کہ اسکول جا کر سعید کو لے آئے۔ گھر میں سب چھوٹے بڑوں کے سامنے کئی مرتبہ خفت کا سامنا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ وہ خود ہی نہیں آئے گی۔ ایک ضدی ہے۔ یہ انہیں اطمینان تھا مگر پھر بھی ان کا دل جانے کیسا کیسا ہو رہا تھا اور وہ کچھ باؤلی سی بنی سارے کمروں میں پھر رہی تھیں۔ اور جب انہوں نے کسی کو بڑے بیٹے سے یہ کہتے سنا کہ سعید کسی کار کے نیچے آگیا ہے تو وہ بالکل سمجھی ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور کچھ دیر بعد جب ان الفاظ کی بجلی حقیقت بن کر ان کے ذہن پر گری تو وہ کھڑے کھڑے گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

سعید کی لاش باہر صحن میں رکھی تھی۔ اور وہ کمرے میں بستر پر بے ہوش پڑی تھیں۔ ابھی انہیں ہوش آیا ہی تھا کہ کیا دیکھتی ہیں ندرت برقع سر سے کھسکاتی اور روتی اندر داخل ہوئی۔ وہ جھپٹ کر اس کی طرف بڑھیں اور اس کے بال نوچ ڈالے۔ اور دیوانوں کی طرح چیخنے لگیں۔ "ڈائن، کٹنی تو نے آخر میرے بچے کی جان لے کر چھوڑی"۔

ندرت نے بمشکل تمام اپنے آپ کو ان سے چھڑایا اور ان کی طرف ترس بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی سوچنے لگی۔ تم اب بھی نہیں سمجھیں ممانی کہ ڈائن میں نہیں تم ہو۔ سعید کو میں نے نہیں تم نے مارا ہے، تم نے اور تمہارے بے ڈھنگے پیار نے۔

بے سمت مسافر

لوگ سمجھ رہے ہیں کہ میں پاگل ہوں جو لینڈ سلائیڈ کی فکر سے بے نیاز گاڑی سے اتر کر اخروٹ کی چھاؤں تلے بیٹھا کچے اخروٹ کا کچا چھلکا چبا رہا ہوں! اخروٹ کی چھاؤں خوش گوار ہے۔ دریا کا قرب بھی۔ دریا کے عین دوسری طرف پہاڑی پر چھوٹا سا ایک گاؤں ہے جس کے کچے مکانوں میں سے ٹین کے کنستر کی چادروں کا بنا ہُوا مسجد کا مینار الگ نظر آ رہا ہے۔ ٹین کے یہ مینار میرے لیے بالکل نئی چیز ہیں۔ کالام جاتے ہوئے میں نے جگہ جگہ یہ مینار دھوپ میں چمکتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس وقت دھوپ نہیں ہے شاید اسی لیے سامنے کا یہ منظر کسی تصویر کی طرح دلکش ہے اُجلا پانی جس کا رنگ ہلکا فیروزی ہے۔ سبزے کے بہت سے شیڈ۔ گھاس سے لے کر اخروٹ کے درختوں، اخروٹ کے درختوں سے لے کر چیڑ کے پیڑوں اور چیڑ کے پیڑوں سے لے کر پتھروں پر جمی ہوئی کائی تک، ہر شیڈ خوبصورت ہے۔

ابھی میں چلا آ رہا تھا تو کوئی بیس گز پیچھے ایک تھانے کے نزدیک دس پندرہ

آدمی اور بچے کچھ غیر معمولی انداز میں جمع تھے۔ مجھے کچھ شک ہُوا کہیں آگے لینڈ سلائڈ نہ ہو۔ رات جب میری آنکھ کھلی ہے تو آسمان کے پرنالوں سے بے تحاشا پانی گرنے کی بھل بھل آواز آرہی تھی۔ عجب بے روک ٹوک بارش تھی کہ بس برسے ہی جا رہی تھی۔ کالام چھوڑنے کی مجھے کچھ ایسی جلدی نہیں تھی مگر مجبوراً چھوڑنا پڑا کیونکہ ریسٹ ہاؤس میں میرا ریزرویشن ختم ہو چکا تھا اور وہاں کے واحد ہوٹل فلک سیر میں رہنا نہیں چاہتا تھا میں ہر ایسی جگہ سے بچنا تھا جہاں غیر ملکی ہوں۔ میں نے تھانے کے نزدیک جمع ان مقامی باشندوں سے ولایتی اردو میں پوچھا:

"آگے سڑک کیسا ہے کوئی لینڈ سلائیڈ تو نہیں بابا۔"

"نئیں سڑک صاف ہے۔ جاؤ جاؤ۔ چلاؤ چلاؤ . . . ." سب نے بہ یک آواز اور بہت بلند آواز سے کہا۔ میں نے محسوس کیا ان کے لہجے میں غیر معمولی جوش و خروش تھا اور چند قدم آگے جانے کے بعد ہی پتہ چل گیا کہ پہاڑی کا ایک ٹکڑا سڑک پر آن پڑا تھا اور سڑک بند تھی۔

آدمیوں کی یہی بھیڑ اب تماشہ دیکھنے آہستہ آہستہ میرے قریب پہنچ رہی تھی۔ ان ہی میں سے کچھ لوگ مجھے رائے دینے آئے کہ میں نزدیک کے تھانے جا کر فون کر کے گینگ بلوالوں یا کسی کو دو ایک روپیہ دے کر گاؤں بھیج دُوں کہ وہ وہاں سے پھاوڑے اور آدمی لے آئے۔ ہو سکتا ہے ان کی مرضی ہو کہ میں کچھ نا وان نکالوں تو یہ دس بارہ آدمی ہی ہاتھ پاؤں مار کے میری نیا پار لگا دیں مگر میں وہ مانجھی ہوں کہ چتو اُٹھے ہاتھ سے رکھے بے فکر بیٹھا ہوں کیونکہ مجھے کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک نہ ایک پڑاؤ تو ایسا آتا ہی ہے جس کے بعد اسے کہیں جانا نہیں ہوتا۔ یہ اور بات کہ یہ پڑاؤ اس کی منزل نہ ہو اور پھر ابھی تو مجھے اپنی زندگی کا، اپنے مستقبل کا فیصلہ بھی کرنا ہے۔ شاید اسی فیصلے سے بچنے کے لیے میرا ذہن ایسی باتیں سوچ رہا

ہے کہ اس سبز چھلکے کے نیچے قدرت نے کیا چھپا رکھا ہے اور پھر اس سخت چھلکے کے نیچے اخروٹ کی گری کس شکل میں موجود ہے . . . . یعنی ایسے آڑے وقت میں میں اخروٹوں کے اندر کے بھید جاننے کے چکر میں پڑا ہوں مگر یہ بھی ہے کہ یہ میری زندگی کا پہلا لینڈ سلائڈ تو ہے نہیں۔

ہر شخص کی زندگی میں نہ جانے کتنے لینڈ سلائڈ آتے ہیں اور زندگی کی چلتی ہوئی گاڑی رک جاتی ہے مگر جب ملبہ ہٹا کر جگہ ہموار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو تشتم پشتم گاڑی نکل ہی جاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ کبھی کوئی کمانی ٹوٹ جاتی ہے کبھی سائلنسر بے کار ہو جاتا ہے، کبھی بریک پہلے کی طرح کام نہیں کرتے مگر ہر مشین چاہے گوشت پوست کی ہو یا دھات کی جلد یا بدیر خراب ہو ہی جاتی ہے تو پھر اس کو بچا کے رکھنے سے فائدہ اور لینڈ سلائڈ تو گھر بیٹھے بھی آجاتے ہیں۔

میری زندگی کا پہلا لینڈ سلائڈ گھر بیٹھے ہی آیا تھا اس وقت میری عمر پانچ سال کی ہوگی۔ میں نے پڑھنا شروع نہیں کیا تھا مگر باجیاں مجھے اکثر اسکول کے ڈراوے دینے لگی تھیں۔ کہتے ہیں چھ سات سال کی عمر سے پہلے مشکل سے ہی کوئی بات یاد رہتی ہے مگر مجھے یاد ہے بس ایسا جیسے کوئی خواب ہو، مگر وہ خواب نہیں تھا کیونکہ بعد کی حقیقتیں اس کی شاہد ہیں۔ رات کا کیا بجا تھا مجھے اندازہ نہیں۔ میں بچہ تھا اور جلد سوتا تھا۔ ان دنوں ٹی وی نہیں تھا اور آج کے بچوں کی طرح گیارہ بجے تک جاگنا بچوں کا معمول نہیں تھا۔ میں تو کوئی سات آٹھ بجے ہی سو جاتا تھا۔ اس کے بعد جب بھی آنکھ کھلتی میرے لیے آدھی رات ہی ہوتی تھی۔

ہاں وہ آدھی رات کا وقت تھا جب کسی کے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ ہم نے نیا نیا گھر بدلا تھا۔ شاید ہی کسی کو پتہ ہو کہ ہم اس گھر میں آئے ہیں۔ ابھی تو سارا سامان بھی بکھرا پڑا تھا۔ باجیاں صبح سے گھر ٹھیک

کرتے کرتے نڈھال ہو کر سو ئی پڑی تھیں۔ جتنی چیزیں سنگوائی گئیں تھیں ان سے کہیں زیادہ بکھری پڑی تھیں۔ اس اجنبی جگہ اور ایسے غیر معمولی ماحول میں اتنے زور زور سے دروازہ دھڑدھڑایا گیا تو ہم سب ہی جاگ اٹھے۔ بجائے دروازہ کھولنے کے ابّو اور امّی کھسر پھسر کرنے لگے۔ ابّو بنیان کے اوپر قمیض پہنتے ہوئے صحن میں آئے اور پھر جلدی سے اندر چلے گئے۔ امّی نے دل پہ ہاتھ رکھ کر بظاہر کڑک دار آواز میں پوچھا: "کون ہے؟"

مگر میں نے دیکھا کہ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ باہر سے کڑاکے دار آواز آئی۔

"پولیس، دروازہ کھولو۔"

پولیس کی آواز سنتے ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ ہمارے ملک میں چھوٹے بچے پولیس کے نام کے ساتھ کبھی کوئی اچھی توقع وابستہ کر ہی نہیں سکتے اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ سب ہی گھر والے خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ امّی نے کچھ دیر اندر سے بحث کرنے کی کوشش کی مگر جب دروازے پر دوبارہ بمباری شروع ہوئی تو انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ان لوگوں کو پھر بھی روکنا چاہتی تھیں مگر وہ دندناتے ہوئے اندر چلے گئے۔ باجیاں دم سادھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھیں۔ سب کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ کچھ سوچ سمجھ نہیں سکتا تھا مگر پولیس کا جو خوف میرے اندر چھپا ہوا تھا اس کی وجہ سے میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ بڑی باجی نے آکر مجھے گلے لگایا اور زبردستی لٹانے کی کوشش کی مگر میں اس گڈے کی طرح جس کے پیندے میں سیسہ لگا ہو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جس وقت پولیس کے ساتھ ابّو نکلے تو چور سے بنے گردن جھکائے ان کے ساتھ چلے گئے۔ امّی، دادی اماں، باجیاں اور میں ہم سب روتے رہ گئے۔ اس کے

بعد کی ساری باتیں تو مجھے یاد نہیں بس اتنا خیال ہے کہ گھر میں اور دل میں ایک خلا سا تھا
ابّو نہیں تھے۔ زندگی کی گاڑی لشتم پشتم چل نکلی تھی مگر میرے لیے یہ ایک زبردست ذہنی
جھٹکا تھا جس کا اثر تمام عمر میرے اوپر رہے گا۔ باجیاں شاید کچھ سمجھتی ہوں یا جانتی
ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ابّو کہاں گئے، کیوں گئے۔ پوچھنے پر بھی مجھے کوئی تسلی بخش
جواب نہ ملتا۔ ہم کہیں جاتے یا کوئی ہمارے ہاں آتا تو ہم پر عجیب سی نگاہیں پڑتیں۔ جن
میں ہمدردی بھی ہوتی اور حقارت بھی۔ میں ان نگاہوں کا مطلب نہیں سمجھتا تھا مگر محسوس
تو کرتا تھا۔ وقت کا احساس نہیں کہ ابّو کتنے دن غیر حاضر رہے، اتنا معلوم ہے کہ سالوں
کا معاملہ تھا۔ ان برسوں کی جو باتیں مجھے یاد ہیں وہ یہ کہ دادی اماں اور امّی نمازیں بہت
پڑھتی تھیں، ہر وقت دونوں کے ہاتھوں میں تسبیحیں رہتی تھیں۔ دیگیں پکتی تھیں جو غرب
غرباء میں تقسیم کی جاتی تھیں اور ان زیوروں کا ذکر ہوتا تھا جو ابّو کے مقدمے کی وجہ سے
بک رہے تھے۔ بڑے لوگ ابّو سے ملنے جاتے تھے مگر مجھے کبھی نہیں لے جایا گیا۔
باوجود میرے رونے پیٹنے کے نہیں لے جایا گیا۔ مجھ سے کہا جاتا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور
ایسے ہسپتال میں ہیں جہاں بچّوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے، مگر محلے کے بچّے
میری طرف انگلیاں اٹھا کر کہتے تھے :

"اس کا باپ جیل میں ہے۔"

سب سے پہلے میں نے جس لڑکے کا سر پھاڑا اس نے اسی قسم کا کوئی جملہ کہا تھا۔
گھر میں ایک مرتبہ یہ طے کیا گیا کہ سجّاد بہت افسردہ رہتا ہے اسے کچھ عرصے
کے لیے چچا کے پاس بھیج دیا جائے وہاں اپنے ہم عمر لڑکوں میں خوش رہے گا۔ چنانچہ
مجھے چچا کے گھر بھیج دیا گیا۔ میری زندگی میں راتوں کے تجربے ہمیشہ نئے اور عجیب رہے
شاید سب کے ساتھ یہی ہوتا ہو۔ رات کو ماحول کے ساتھ لوگ بھی بدل جاتے۔ میری چچی
جو دن میں میرا دلار کرتیں رات کو ہم لوگوں کے بارے میں چچا سے عجیب عجیب باتیں کرتیں۔

اور یہ سب میرے نزدیک آدھی رات کو ہوتا۔ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے مجھے اچھی طرح نیند نہ آتی اور میں چپ چاپ پڑا چچا چچی کی باتیں سنا کرتا۔ جواب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ چچی کہتیں :

"آپ دیکھ رہے ہیں آپ کی امّی سارا زیور بڑے بھیّا کے مقدمے میں کھپا رہی ہیں، آپ ان سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ ہمارا حصّہ ہمیں دے دیں۔"

"ہمارا حصّہ کیسا؟ زیور ان کا ہے وہ جو چاہیں کریں۔"

"واہ، اتنے ڈھیروں زیوروں میں ہمارا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ آخر ان کے بعد وہ سب میں برابر تقسیم ہوگا یا نہیں۔"

"ہاں جو بچے گا وہ سب میں تقسیم ہو جائے گا، زندگی میں تو وہ اس کی مالک ہیں۔"

"میں نے سُنا ہے کہ وہ کلیم کی زمین بھی بیچ رہے ہیں۔ وہ بھی اس مقدمے میں کھپ گئی تو ہمارا کیا ہوگا، آخر ہمارے بھی بچے ہیں۔"

"زمین بھی تو ان ہی کی ہے۔"

"میں پوچھتی ہوں بڑے بھیّا نے جو اتنا کمایا وہ کہاں گیا جو یہ زیور اور زمینیں بک رہی ہیں۔"

"اتنے دنوں میں پلے لگ گیا ہوگا۔"

"اجی گدیلے بھرے ہوتے تھے نوٹوں کے، جس گدّے پہ ہماری جٹھانی سوتی تھیں اس میں روئی نہیں تھی۔ نوٹ ہی نوٹ تھے۔"

"اچھا! پھر تو تم نے بھی کچھ ضرور نکال لیے ہوں گے۔"

"ارے ایسے ہوتے تو آج بھلے دن نہ ہوتے۔ میں کہتی ہوں سب چالاکی ہے اپنا روپیہ چھپا دیا کہ ایسے وقت میں ماں انکار تھوڑی کرے گی اور تم ہو کہ اتو بن رہے ہو۔ بس ایک ہی بیٹا انہیں پیارا ہے، بیٹا بھی وہ جس نے سارے خاندان کی ناک

کٹادی۔ میری بات یاد رکھنا اگر زلیو اور کلیم کی زمین کی طرف سے غافل ہوئے تو کوڑی بھی ہاتھ نہ آئے گی۔"

"اچھا میں امی سے بات کروں گا، اب سو جاؤ۔"

چچا چچی سو جاتے مگر میں گھنٹوں جاگتا رہتا۔ ہزار سونے کی کوشش کرتا مگر ایسا لگتا جیسے کھڑکی سے چاند میری آنکھوں میں گھسا چلا آرہا ہے، اور محلّے بھر کی چکوریں صرف میری نیند اڑانے کے لیے چلّا رہی ہیں۔ اصل میں میرا ذہن اس گدیلے کو اُدھیڑنے میں مصروف رہتا جس میں روئی کے بجائے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ کیا وہ گدّا بہت نرم ہوگا، نہیں اسے تو سخت ہونا چاہیئے۔ امّی کے گدّے پر تو میں اکثر لیٹتا ہوں مجھے تو کبھی کوئی فرق محسوس نہیں ہُوا۔ کبھی اس میں سے چُرمُر کی آواز نہیں آئی۔ چھوٹا تھا تو اکثر اس پر پیشاب بھی کر دیتا تھا۔ پیشاب سے تو سارے نوٹ خراب ہو گئے ہوں گے یہ ابّو امّی کو کیا سُوجھی۔ کبھی نوٹ گدّوں میں بھر کر رکھے جاتے ہیں۔ دن میں ایسی ہی باتیں ان کے بچّے مجھ سے کیا کرتے۔ چچا کے سارے بچّے شیطان کے خالو تھے۔ وہ مجھ سے کہتے کہ میرے ابّو قتل کی سازش میں شریک تھے اور انہوں نے بے حد و حساب رشوت لی تھی۔ ان کے پاس سونے چاندی کی اینٹیں تھیں۔ بھری بوریاں نوٹوں کی تھیں میری امّی کے پاس سیروں کے حساب سونا تھا اور ہم سب جن پلنگوں پر سوتے تھے جن کرسیوں پر بیٹھتے تھے، جو کپڑے پہنتے تھے جو ریڈیو سنتے تھے وہ سب حرام کے پیسے کے تھے۔ لفظ "حرام" سب سے پہلے میں نے وہیں سنا اور سیکھا۔ میرے لیے یہ لفظ دنیا کا غلیظ ترین لفظ تھا اور میں ابّو کا نام کسی طرح بھی اس لفظ کے ساتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں جھنجلاتا، روتا اور ان بچّوں کو حرامی کہتا۔ زندگی میں یہ پہلی گالی تھی جو میں نے سیکھی۔ اس ایک لفظ کے علاوہ بھی بہت سی گالیاں سیکھ کر میں اپنے گھر واپس آگیا۔

اپنے ساتھ میں ڈھیروں سوالوں کی گٹھریاں لایا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں پوچھے تھے۔ میں قتل اور رشوت کے معنی جاننا چاہتا تھا۔ میں بوریوں میں بھرے نوٹ دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے سونے چاندی کی اینٹیں دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ ہر پلنگ کی چادر اٹھا کر گدے کو چھو چھو کر دیکھتا تھا۔ میں نے امّی کے گدّے کو قینچی سے کاٹ کر بھی دیکھا، مگر وہاں رُوئی کے سوا کچھ نہ تھا۔ سونے چاندی کی اینٹیں اور بوریاں بھرے نوٹ بھی دیکھنے کو نہ ملے، بلکہ کچھ دن بعد یہ ہُوا کہ سب کے کپڑے آہستہ آہستہ پھٹنے لگے۔ باجیاں روز اسکول جانے سے پہلے ہزاروں نصیحتیں کرتیں۔ جو چیز ٹوٹ جاتی وہ ویسی ہی پڑی رہتی۔ ریڈیو خراب پڑا تھا۔ استری بے کار پڑی تھی۔ بجلی کی کیتلی ناکارہ ہو گئی تھی۔ میری ٹرائیسکل کباڑی کی نذر ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے سنا امّی نے اخبار والے کو اخبار لانے سے منع کر دیا۔ خواہ مخواہ کا خرچ، پڑھتا کون ہے یونہی لڑھکتا پھرتا ہے۔ اب میرے اسکول بھیجے جانے کا ذکر زیادہ ہوتا مگر باوجود عمر ہو جانے کے مجھے داخل نہیں کروایا جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا۔ اس کی وجہ سکول کی بھاری فیس کتابوں اور کپڑوں کا بوجھ تھا۔ وہ بوجھ جو پہلے پتّے کی طرح ہلکا تھا۔ یکایک اب بہت بھاری ہو گیا تھا۔ میں خوش تھا کیونکہ مجھے اسکول سے ایسی زبردست دلچسپی بھی نہیں تھی۔

ایک دن چچی اور چچا خوب تیار ہو کر آئے۔ بڑی تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ دادی امّاں روئیں۔ جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بڑبڑاتی رہیں، انہوں نے ابّو کو بھی بُرا بھلا کہا، چچا چچی کو بھی، چچی روئیں، امّی روئیں، چچا دھاڑتے رہے اور پھر چچا چچی آئندہ کبھی نہ آنے کی دھمکی دے کر چلے گئے۔ اس دن میں نے باجیوں کو پہلی مرتبہ بڑوں کے سامنے چپڑ چپڑ کرتے دیکھا۔ چچا چچی کو کوسا اور سارے خاندان سے ناطے توڑنے کی باتیں کرنے لگیں جن میں سے کوئی ان کا سچّا ہمدرد نہیں۔ سب تماشا دیکھنے اور الٹی سیدھی نصیحتیں کرنے کو ہیں۔ ان سے تو غیر ہزار درجے اچھے ہیں جو دامے درمے سخنے ہر طرح

مدد کرتے ہیں۔

گھر کا ماحول انتہائی بدحالی کو پہنچ کر پھر کچھ ٹھیک ہو چلا تھا۔ بڑی باجی نے ایک فرم میں نوکری کر لی تھی۔ مقدمہ جیتنے جانے کی امید تھی۔ باجی کے پاس اس سلسلے میں بہت بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ باجیاں پھر نئے ریشمی کپڑے خرید کر لانے لگی تھیں۔ ریڈیو ٹھیک ہو گیا تھا، اخبار دوبارہ آنے لگا تھا اور بالآخر مجھے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ بھی ہے کہ مجھے کپڑوں سے، کتابوں سے، فیسوں سے یا اوپر کے جیب خرچ سے کبھی کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔

اور پھر ایک دن ابّو بھی آ گئے۔ جو چیز سامنے نہ ہو اور اس کا تصوّر ہی باندھتے رہو تو وہ حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ شاید یہی میرے ساتھ ہوا۔ میرے تصور کے ابّو گورے چٹّے، لمبے چوڑے ہینڈسم آدمی تھے مگر اصل ابّو ادھ کھچڑی بالوں والے، سانولے اور دبلے سے آدمی تھے جن سے پیار کرنا تو ممکن تھا مگر ان پر فخر کرنا مشکل تھا۔ ان کے آنے کے دوسرے یا تیسرے دن گھر میں ایک میلاد کیا گیا جس میں میلاد کم اور خاندان بھر کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ ابّو صحن میں بیٹھے تھے۔ جو آتا مٹھائی کا ڈبہ اور پھولوں کے ہار لیے۔ مجھے جو بات سب سے عجیب لگی وہ یہ کہ ابّو کے گلے میں ہار ڈالنے والا انہیں دس، بیس، پچاس کے نوٹ بھی دیتا جسے وہ سلام کر کے لے لیتے۔ ایک بار گی ہی کیا ہوا میں بھاگا ہوا ابّو کے پاس گیا اور چلّا کر کہا۔

"ابّو آپ پھر رشوت لے رہے ہیں۔ پولیس آپ کو پکڑ کر لے جائے گی۔"

لگتے ہوئے قہقہے دفعتاً تھم گئے۔ کچھ عجیب ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔ بڑی باجی نے ایک تھپڑ میرے لگایا اور گھسیٹتی ہوئی مجھے وہاں سے ہٹا لے گئیں اور سنتے پھر وہ مجھے چپقیاتی رہیں۔ "زبان بہت چل نکلی ہے، زمین سے اُگے نہیں اور لگے باتیں بنانے۔"

اس دن میلاد کے بعد مجھے مٹھائی کھانے میں ذرا بھی مزا نہیں آیا۔ ابّو کے

آنے کے بعد کے جو سہانے سپنے میں نے دیکھے تھے وہ پورے ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ نہ وہ سیر سپاٹے نہ وہ خرید و فروخت۔ ابّو زیادہ تر گھر ہی میں رہتے اور خاموش کھوئے ہوئے سے۔ امّی میرے بجائے اب ان کی للّو پتّو میں لگی رہتیں۔ حلوے بنا بنا کر اور بادام پیس پیس کر کھلاتیں۔ باجیاں اب کسی کا غم نہیں کھاتی تھیں۔ بڑی باجی کے فرم کے شاید کوئی اوقات ہی نہیں تھے۔ نہ ان کے آنے کا وقت مقرر تھا نہ جانے کا۔ ان سے چھوٹی جو بی ایس سی کر رہی تھیں۔ ان کے پریکٹیکل بہت دیر سے ختم ہوتے تھے اور ان کا کالج بھی دُور تھا۔ وہ تھکی ہاری لوٹتیں تو گھر میں کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتیں۔ ان سے چھوٹی میٹرک میں تھیں۔ معلوم ہوتا تھا شاید انہیں بورڈ میں ٹاپ کرنا ہے چوبیس گھنٹے کتابیں تھیں اور وہ۔ ان سے چھوٹی جو مجھ سے صرف دو سال بڑی تھیں خود کو کم افلاطون نہیں سمجھتی تھیں۔ میرے ساتھ کھیلنا انہیں عار تھا۔ سارا دن محلے بھر میں کدکڑے لگاتیں، محلے کی خبریں سناتیں اور اکثر ادھر کی ادھر کرنے میں مار بھی کھاتیں۔ اور دادی اماں بس دن بھر نمازیں پڑھے جاتیں یا قرآن شریف۔ ان سے فارغ ہوتیں تو تسبیح ان کے پاس ہوتی۔ چاہے جمعدارنی کو نالی صاف نہ کرنے پر ڈانٹ رہی ہوں چاہے ملازم کو کتّے کو کھانا کھلانے کی ہدایت کر رہی ہوں۔ تسبیح کھٹا کھٹ چلتی رہتی۔ غرضیکہ کسی کے پاس وقت نہیں تھا کہ میری بھی کچھ سنے۔ اسکول میں جو کچھ پڑھایا جاتا وہ کم ہی میری سمجھ میں آتا اور گھر کا کام جو ملتا وہ میرے بس کا نہ ہوتا۔ کوئی مجھے اس کام میں مدد نہ دیتا۔ دوسرے دن اسکول میں ڈانٹ پڑتی تو میرا دل اسکول سے کچھ اور اچاٹ ہو جاتا۔

اتنی دیر میں کالام سے آنے والی کچھ اور کاریں جمع ہو گئی ہیں۔ ان کا تماشہ دیکھنے کے لیے کچھ اور مقامی لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یہ ایک بچی کتنی پیاری ہے۔ سیب کو مات کر رہے ہیں اس کے گال۔ ننگے پاؤں، بکھرے بال، مست مولی سی۔ یہ پہاڑی لڑکیاں

جو مست مولی سی ہوتی ہیں کیا اندر سے یہ بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسے اور شہر کی لڑکیاں شاید سب لڑکیاں ایک ہی سی ہوتی ہیں یا شاید نہیں ہوتیں۔ وہ میرے پاس کھڑے ہو کر مجھے غور سے دیکھ رہی ہے۔ اور پھر یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی ہے میں دفعتہً بھول گیا کہ میں خود کو غیر ملکی سمجھوانا چاہتا ہوں اور نہایت شفاف اردو میں اس کے پاس کھڑے لڑکے سے پوچھنے لگا:

"ہنس کیوں رہی ہے یہ چھوکری۔"

اور لڑکے نے میری امید سے کہیں زیادہ اچھی اردو میں جواب دیا۔

"تم نے عورتوں کی طرح دنداسہ جو لگایا ہے۔"

میں حیران ہو کر سوچتا ہوں میں نے تو ایسی کوئی چیز نہیں لگائی۔ میں اٹھ کر بچھا یا جھاڑتا ہوا کار کے شیشے میں دیکھتا ہوں اور وہ جو اخروٹ کا چھلکا میں نے چبایا تھا اس نے میرے ہونٹوں کو لال کر دیا تھا جو آہستہ آہستہ دنداسے کی سیاہی میں تبدیل ہو رہے تھے۔ میں خود بھی ہنس پڑا۔ میں نے اپنے آپ کو غور سے آئینے میں دیکھا میرے بڑھے ہوئے سنہری بالوں کے پٹے کسی خوبصورت درویش کی طرح میرے کاندھوں پر پڑے تھے۔ میری بھوری آنکھیں اور سفید جلد سوات کے خوب صورت موسم کے اثر سے چمک رہی تھی۔ میری نوزائیدہ ڈاڑھی مکئی کے سنہری ریشوں کی طرح باریک اور نرم تھی اور دنداسہ لگے میرے ہونٹ کسی سواتی دوشیزہ کے ہونٹوں کی طرح بھرے بھرے لگ رہے تھے۔ گریبان کھلا، کڑھا ہوا کرتہ، رنگ اتری جینز، سنہری کمانی کا ہلکے سبز رنگ کا چشمہ۔ میں قطعی غیر ملکی سیاح لگ رہا تھا۔ اچھا ہی کیا جو میں یہاں چلا آیا۔ اتنے سیاحوں میں میں بھی ایک سیاح ہی تو تھا۔ دیکھا جائے تو دنیا کا ہر آدمی سیاح ہے جو اس دنیا کی سیاحت کے بعد جلد یا بدیر واپس لوٹ جاتا ہے۔ ہر سیاحت میں لینڈ سلائڈ آتے ہیں کسی کی راہ میں کم کسی کی راہ میں زیادہ۔

ابو پہلے سے ابو نہ رہے تھے۔ باقی بھی سب کچھ ویسا نہیں رہا تھا۔ پھر بھی بہت کچھ وہی تھا۔ دنوں کی شورشیں بھی وہی تھیں، راتوں کے سپنے بھی وہی تھے وہی رات کو ہر بات عجیب طرح سحر زدہ سی ہو جاتی تھی کہ صبح اٹھ کر سوچنا پڑتا تھا آیا جو کچھ دیکھا سچ مچ ہوا تھا یا خواب تھا محض۔ ایک رات آنکھ کھلی تو امی بڑی باجی کو اتنی دیر سے آنے پر ڈانٹ رہی تھیں اور وہ دُو بدو جواب دے رہی تھیں۔

"جس گیسٹ کو لینے جانا تھا اس کا جہاز اسی وقت آیا تو میں کیا کروں۔ یا تو آپ مجھے گھر بٹھا لیجئے یا سوال جواب نہ کیا کیجئے۔"

"آہستہ بولو۔" امی نے کہا۔ "میں تو سمجھتی ہوں مگر تمہارے ابو... معلوم ہے میں اُن سے روز جھوٹ بول دیتی ہوں کہ تم دس بجے تک آ گئی تھیں۔"

"تو آپ ان کو بھی سمجھا دیجئے۔ ان کو بھی بتا دیجئے کہ اگر وہ مجھے پردے کی بوبو بنا کر بٹھانا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں مگر وہ مردوں کی طرح باہر نکلیں اور کما کر لائیں۔ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ روز کے حلوے پراٹھے یہ بھائی بہنوں کی فیسیں، یہ ٹیم ٹام ایسے ہی تو نہیں بنی ہوئی۔"

"میں کہہ رہی ہوں آہستہ بولو۔ تم اپنے باس سے یہ تو کہہ سکتی ہو کہ..."

"میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی وہ کل ہی دوسری لڑکی کا انتظام کر سکتا ہے ...... اور پھر آپ ڈرتی کیوں ہیں۔ میں بچی تو نہیں ہوں اور یوں بھی کراچی میں دن رات میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" ساڑھی کھول کر پلنگ پر ڈالتے ہوئے وہ غسل خانے میں گھس گئیں۔ امی واپس چلی گئیں۔ میں کچھ دیر اندھیرے میں آنکھیں جھپکاتا رہا اور پھر سو گیا۔

باجی نے سچ کہا تھا کراچی میں دن رات میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جب تک میں نویں کلاس میں پہنچا۔ میرے بہت سے ساتھی لڑکے مجھے یہ بات سمجھانے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ راتوں کو ہم مٹر گشت کرتے۔ سیکنڈ شو کے بعد ہل پارک چلے جاتے

یونہی سڑکوں پر اسکوٹروں پر ریس کرتے پھرتے۔ ساحل سمندر پر ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے۔ میرے ساتھ ہی کئی لڑکے تھے جنہیں قاعدے سے کالجوں میں ہونا چاہیئے تھا مگر ہم ڈاڑھی مونچھوں والے ہو کر ابھی تک اسکول کی چار دیواری سے ہی سر ٹکرا رہے تھے۔ گو دنیا کے اور جھمیلوں میں ہم بہت آگے تھے۔ ہم ان لڑکوں کو منہ بھی نہ لگاتے تھے جو سفید سفید لڑکیوں کے سے گال لیے نویں دسویں کلاس میں چلے آتے تھے۔ ان کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی۔ آوازیں لڑکیوں کی طرح باریک تھیں۔ ہمیں ان کی محفوظ زندگیوں پر رشک نہیں ہنسی آتی تھی۔ مغرب کے وقت گھر نہ پہنچیں تو بے چاروں سے باز پرس ہوتی تھی۔ ہم ایسے لڑکوں کو زنخوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ لڑکے تھے جو کبھی چھپ چھپا کر "صرف بالغوں کے لیے" کا لیبل لگی کوئی فلم دیکھ آتے تھے تو گھنٹوں کانپتے تھے۔ کراچی کے اس شبانہ ٹین ایجر کلب کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی تھی جہاں ہر ہفتے کی رات کو ٹین ایجر لڑکے لڑکیوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ ہاؤ ہُو کا طوفان۔ ناچ اور اس بلا کا شور کہ اگر ہماری امی لمحہ بھر کو وہاں چلی جاتیں تو ان کے کانوں کے پردے پھٹ جاتے یا دماغ کی چولیں ہل جاتیں اگر امی وہاں چلی جاتیں اور اتنی کم عمر لڑکیوں کو ایسے نیم عریاں لباسوں میں، مالائیں لٹکائے ہاتھ میں جام تھامے لڑکوں کے گلوں سے گلے ملائے لیٹے بیٹھے دیکھتیں تو واقعی ان کا ذہن چکرا جاتا۔ مگر وہاں تو کوئی کسی کا نوٹس ہی نہیں لیتا تھا۔ کتنی ہی دفعہ میں ایک ہفتے کی پہنی ہوئی بغیر استری کی گول ہوئی پتلون پہنے چلا گیا جو کسی نے نظر اٹھا کر دیکھا ہو۔ سب اپنے ہاؤ ہُو میں گم رہتے۔ سب اکٹھے تھے مگر سب الگ۔ شاید حشر میں بھی یہی کچھ ہوگا۔

مگر ایک بات کا اعتراف کرتا چلوں کہ ابھی تک زندگی کے جو سبق میں نے سنے پڑھے یا دیکھے وہ زیادہ تر تھیوری ہی میں تھے۔ جس طرح ہمارے کالجوں سے لڑکے

انجینئرنگ پاس کر کے نکلتے ہیں تو مشینوں کے سامنے کھڑے رہ جاتے ہیں اسی طرح جہاں زبانی میں نے بہت کو مٹھے چھانے تھے بہت سی لڑکیوں کے ساتھ بہت کچھ کیا تھا۔ اصل میں پریکٹیکل میں ابھی میں اتنا ہی کورا تھا جتنا وہ لڑکے جن کے منہ سے دودھ کی بو آتی تھی۔ لڑکے مجھے بھینچتے تھے، اکساتے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے تھے مگر میں ڈرتا تھا جس طرح پہلے پہل تیرنے والا پانی میں چھلانگ لگانے سے ڈرتا ہے۔ میں ان کنواری لیڈی ڈاکٹروں کی طرح تھا جنہوں نے سینکڑوں بچے جنوائے ہوں مگر خود جنس کے کسی مرحلے سے نہ گزری ہوں مگر ظاہر ہے کہ لیڈی ڈاکٹر ایک بارہ سالہ انجان لڑکی کو تو اس معاملے میں جاہل ہی گردانے گی۔

میرا اٹھنا بیٹھنا زیادہ تر امیر لڑکوں میں تھا۔ اس عمر میں لڑکے بدلے کی اتنی فکر نہیں کرتے جن کے پاس ہوتا ہے بے دریغ لٹاتے ہیں۔ میرے پاس کار نہیں تھی مگر روپے پیسے کی طرف سے ہاتھ تنگ بھی نہیں تھا۔ چار بیٹیوں کے اوپر میں ایک بیٹا تھا۔ دادی کا، باپ کا، ماں کا اور باجیوں کا، سب ہی کا لاڈلا تھا میرے مانگنے پر کبھی کسی طرف سے انکار نہیں ہوا۔ بی ایس سی کرنے کے بعد نمبر دو باجی کو ایک بے حد فرسٹ کلاس نوکری مل گئی تھی، گھر میں اچھی خاصی ریل پیل تھی۔ تنگی ترشی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے جو فرق محسوس ہوتا تھا وہ یہ کہ وہ پہلی سی گھریلو فضا نہیں رہی تھی۔ ہم سب مشکل سے ہی اکٹھے ہوتے تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی کو کہیں نہ کہیں جانا ہوتا تھا امّی کا، باجیوں کا اور میرا خیال تھا کہ کم از کم ایک کار تو ہونی ہی چاہیئے مگر ابّو کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ ایک گاڑی اس گھر میں کیا تیر مارے گی جہاں نہ کسی کے آنے کا وقت تھا نہ جانے کا۔ ہم سب یونہی دوستوں کی گاڑیوں پر گزارہ کر رہے تھے البتہ بڑی باجیوں کو لینے اور چھوڑنے ان کی ذموں سے کاریں آتی تھیں۔ نمبر دو باجی جو زیادہ طرار تھیں انہوں نے تو پہلے دن ہی باس کو بتا دیا تھا کہ میں ہر وقت آنے کو تیار ہوں مگر گاڑی کے بغیر

ہرگز نہیں آؤں گی۔ ان کی فرم میں کاروں کی کمی تھوڑا ہی تھی۔ ایک سے ایک جدید کار اور نیا ماڈل انہیں لینے آتا مگر وہ اس درجہ کی نخریلی تھیں کہ مجال ہے کسی کو اپنے ساتھ بٹھا کر دو قدم لے جائیں۔ بنتی تھیں بڑی اصول پرست " نہ بھائی! فرم کی گاڑی ہے میں کسی کو نہیں بٹھاؤں گی۔ کل کلاں کو ڈرائیور نے کسی سے جڑ دیا تو میری کیا عزت رہ جائیگی" بڑی آئیں وہاں سے۔ خیر مجھے کون سی ان کی پروا تھی۔ میرے پاس بھی ایک سرخ بیربہوٹی سا اسکوٹر تو تھا ہی جس کو میں آئینہ کی طرح چمکا کر رکھتا تھا اور جو خالص میری ملکیت تھا۔

ایک رات امی نے چھوٹی باجی کو دیر سے آنے پر ٹوکا اور ابو کا ڈر اوادیا۔ تو وہ پھنکاریں۔ " ذرا ابو سے بھی تو پوچھیئے کہ وہ راتوں کو کون سی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اگر وہ مجھ سے کچھ سوال جواب کرنا چاہتے ہیں تو میں دو بدو کرنے کو تیار ہوں " اس کے بعد امی کچھ نہ بولیں۔ باجی بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور امی پھُس پھُس روتی رہیں۔ میں نے سوچا واقعی اب ہم لوگ بڑے ہو گئے ہیں لیکن پرانی نسل ہیں بڑا ماننے کو تیار نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر ایک آدمی رات کو بارہ ایک بجے گھر آئے۔ کراچی میں رات دن میں ایسا فرق ہی کون سا ہے۔ دن سے زیادہ اجالا تو یہاں رات کو ہوتا ہے۔ سڑکیں جھما جھم کرتی ہیں۔ آسمان کو دیکھو تو ہر وقت روشنی کا ایسا غبار سا چھایا رہتا ہے کہ کراچی میں رہنے والے بے چارے گھپ اندھیری راتوں کا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔ صبح تک ہوٹل اور ریستوران کھلے رہتے ہیں۔ کاریں رکشائیں اور ٹیکسیاں چلتی رہتی ہیں۔ بسیں بھی یونہی دو ایک گھنٹے کے لیے اونگھتی ہوں گی۔ رات یہاں ہوتی ہی کب ہے اور کراچی غریب سوتی ہی کب ہے۔ یہ تو اس مجبور عورت کی طرح ہے جسے رات کو میاں نہ سونے دے اور دن کو بچے۔

ایک دن میرا ایک دوست ذاکر پوچھنے لگا "یار تمہارے والد مقدمے سے تو بری ہو گئے تھے نا؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

"اب کیا کرتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں، نوکری سے انہوں نے خود استعفائے دیا ہے۔"

"اگر تم کہو تو میں اپنے ابا سے کہوں کہ وہ تمہارے والد کو کہیں لگا دیں۔"

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"کمال ہے تمہیں نہیں معلوم، بھئی بہت بڑا بزنس ہے ان کا، تقریباً ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔"

"تمہیں یکایک ابو کا خیال کیسے آیا؟"

"کل میں نے ان سے ملتا جلتا ایک آدمی دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ عرصے سے میں نے تمہارے والد کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ ہاں یار دیکھو تو کیسا فراڈ ہے۔ کل میں وہاں گیا جہاں اسمگلڈ مال ملتا ہے۔ وہاں سے میں نے یہ گھڑی خریدی، الفی کے ایک دکان دار کو دکھائی تو وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا یہ اس کمپنی کی گھڑی ہی نہیں ہے جس کا نام اس پہ لکھا ہوا ہے۔ مشہور گھڑیوں کے خالی ڈائل اور نچلے حصے بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پہ ہانگ کانگ میں ہو رہا ہے۔ جن میں یہ روسی ساخت کی معمولی مشینیں فٹ کرتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ گھڑیاں اسمگل ہو کر دوسرے ملکوں میں بکتی ہیں۔ لوگ جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں سمجھ کر دھڑا دھڑ خریدتے ہیں۔ دوکان دار نے مجھے گھڑی کھول کر دکھائی واقعی گھڑی کی مشین کیس کے سائز کی بھی نہیں تھی۔ کیس میں ایک الگ رنگ میں اسے فٹ کیا گیا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ گھڑیاں شاک پروف تک نہیں ہوتیں۔ اس رنگ سے ہی انہیں شاک پروف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یار کیسا فراڈ ہے۔ بعد میں ابا نے بھی اس بات کی تصدیق کی اور کہا کہ مجھ سے پوچھتے تو میں کبھی یہ گھڑی لینے کی رائے نہ دیتا۔ اُسی وقت

ابّا نے مجھے ایک اومیگا نکال کر دی جو ابّا کے کوئی دوست حج سے آتے ہوئے جدہ سے لائے تھے۔ "یہ دیکھو۔" اس نے کف ہٹا کر گھڑی دکھائی۔ گھڑی تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ بڑی اتنی جیسے کوئی کمپس، یوں جگہ جگہ کر رہی تھی کہ کیا کوئی ہیرے کا زیور کرے گا۔ یونہی بے خیالی میں میری نظر اپنی کلائی پہ گئی۔

"تمہاری گھڑی کیا ہوئی؟" اس نے پوچھا۔

"مرمت کے لیے دی ہے۔"

"لو تم یہ لے لو۔" اس نے جیب سے گھڑی نکالی اور میری کلائی پہ باندھنے لگا۔

"نہیں یار میرے پاس ہے جو۔"

"پھینکو اسے جانے کب کی سڑی ہوئی ہے۔"

"نہیں بھئی بات سنو۔"

"دیکھو میرے لیے یہ ویسے بھی بے کار ہے۔ سستی سی ہے۔ فراڈ ہے یہ بھی میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ زیادہ چلے گی نہیں بس ذرا شو ہے باندھ لو جب خراب ہو جائے پھینک دینا۔"

میں نے اپنی کلائی کو دیکھا۔ فراڈ ہو یا کچھ۔ اس وقت تو وہ میرے ہاتھ پر بندھی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔

"تھینک یو ڈاکر" میں نے کہا۔

"ناٹ ایٹ آل اچھا۔ شام کو ضرور آنا کلب" کہتا ہوا وہ چلا گیا۔

میں بہت دیر تک اپنی کلائی دیکھتا رہا۔ باجیوں پہ جو روز مجھے نئی سے نئی چیزوں سے جلاتی ہیں کچھ تو رعب پڑے گا۔

ایک بس کی چھت پہ بیٹھ کر کچھ لال پگڑی والے آ گئے ہیں۔ چاروں طرف کے سبزے میں ان کی سرخ پگڑیاں لالے کے پھول کی طرح خوبصورت معلوم ہو رہی

ہیں۔ یہ پی ڈبلیوڈی کے آدمی ہیں اور بھاوڑے کدالیں لیے فی الحال باتیں کرنے میں مصروف ہیں۔ مسافر بے چینی سے ہاتھ مل رہے ہیں۔ سب کو کہیں نہ کہیں جانے کی جلدی ہے مسافر مجھے کسی حادثے میں زخمی ہو جانے والے کے عزیزو اقارب لگ رہے ہیں جو مریض کو جلد از جلد ڈاکٹر کو دکھانا چاہتے ہیں اور لال پگڑی والے وہ ڈاکٹر جن کے لیے حادثے میں زخمی ہونے والا محض ایک کیس ہے۔ صبح سے شام تک آنے والوں میں سے ایک اور کیس۔ دیکھنا تو انہیں ہے ہی مگر دیکھ لیں گے اب ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ مسافروں کی ہائے پکار سے مجبور ہو کر لال پگڑی والے بے دلی سے سلائڈ کی کیچڑ اچھالنے میں مصروف ہیں۔ انھیں بھی میری طرح کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔

میں اٹھ کر کار میں آبیٹھا ہوں اور یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ موسم ابھی تک اتنا ہی ہوش رُبا ہے مقامی لوگ ابھی تک جمع ہیں۔ کتنی بے پناہ فرصت ہے ان پہاڑی لوگوں کو۔ میں حیرت سے سوچتا ہوں۔ میری کار کا ریڈیو بہت دیر سے رِم جھم قسم کے گیت گا رہا ہے جو اس موسم میں بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ میرے دل میں کسی قسم کے خوف کا کوئی شائبہ نہیں ہے جبکہ کہا جاتا ہے کہ چور کا دل پتہ کھڑکنے پر بھی دھڑکنے لگتا ہے اور میں تو ایسا پکا چور بھی نہیں ہوں۔ لیکن کچھ ایسا لگتا ہے جیسے میرا ضمیر صاف ہے جیسے ہر طرح انصاف میرا منتظر ہے۔ اگر میں بچ گیا تب بھی انصاف ہوگا اور پکڑا گیا تب بھی انصاف ہی ہوگا۔ میں انسانی انصاف سے زیادہ خدائی انصاف پر یقین کیے بیٹھا ہوں۔ اگر خدا مجھے بے گناہ سمجھتا ہے تو وہ مجھے بچالے گا اور اگر وہ مجھے مجرم سمجھتا ہے تو پکڑوا دے گا۔ میں دونوں صورتوں میں راضی برضا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ میں کوئی بہت خدا پرست آدمی ہوں۔ آپ اسے محض میرا بچپنا کہہ سکتے ہیں۔ ویسے مجھ پر

خدا پرستی کا دورہ بھی پڑ چکا ہے ـــــ اُن دنوں مجھ پر تبلیغ کرنے والے چند لڑکوں کا اثر روز بروز زیادہ ہو رہا تھا۔ لڑکپن میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آدمی کبھی ایک طرف جھکتا ہے کبھی دوسری طرف۔ میں بڑی باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگا تھا۔ جمعہ کے جمعہ مسجد میں نماز ادا کرتا تھا اور ویسے بھی جب وقت ملتا تھا مسجد میں چلا جاتا تھا۔ جہاں قرآن کا درس لیتا تھا۔ روحانی پاکیزگی کا ایک دورہ سا تھا۔ ان دنوں عبادت اور ریاضت کے بارے میں ہی کتابیں پڑھتا تھا۔ میں سوچتا تھا لوگ کتنے احمق ہیں خالی وقت پکچر دیکھنے اور گپیں مارنے میں صرف کرتے ہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ درود پڑھنے سورۃ فاتحہ، سورۃ رحمٰن اور سورۃ یٰسین پڑھنے کے کیا فضائل ہیں ـــــ وضو کرنے نماز کے لیے مسجد کی طرف قدم بڑھانے کی کل اتنی نیکیاں بنتی ہیں کہ حدوحساب سے باہر۔ لوگوں کی جان بوجھ کر یہ غفلت میری عقل سے قطعی بالاتر تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ روز صبح انسان یہ سنے "کہ نماز نیند سے بہتر ہے" اور پڑا سوتا رہے۔ ان دنوں یہ کیسی ناقابلِ یقین بات لگتی تھی۔ پرانے دوستوں سے میں نے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ یہ سوچ کر کہ میں نے کیسے لہو ولعب میں پڑے ہوئے لڑکوں کو دوست بنایا تھا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا اور معافی مانگتا۔ دادی کہا کرتی تھی "وہ اپنے بندوں پر توبہ کا در کبھی بند نہیں کرتا"

اس زمانے میں بھی حج پر جانے والوں کا بڑا زور شور تھا۔ جس کو دیکھو حج پر جا رہا ہے۔ اندرونِ ملک بھی ریل گاڑیاں سارا سال حاجیوں کو ڈھوتیں۔ چھ مہینے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ چھ مہینے آنے والوں کا۔ ان دنوں میں بڑی سنجیدگی سے سوچتا اگر ابّو اجازت دیں تو کیوں نہ میں حج کر آؤں۔ روحانی جذبے کی شدّت سے حج پر جانے کی سچی طلب ہی نہیں تھی بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے محرومی ایک دائمی خلش بن جائے گی۔

یہ زمانہ تھا، یہ سوچ تھی جب ایک دن ذاکر آیا اور مجھ سے ٹین ایجر کلب چلنے کو کہا۔ بڑے عالموں کی سی دھیرج مجھ میں کہاں تھی کہ خود اپنی راہ چلتا اور اسے اپنی راہ چلنے دیتا۔ نئے نئے مذہبی جنون نے مجھے اسے راہِ راست پہ لانے پر اکسایا۔ پہلے تو وہ مذاق میں ٹالتا رہا۔ مگر جب میں گھٹ مُلّا بن کے اس سے چمٹ گیا اور دوزخ کے ڈراوے دینے لگا تو وہ بولا:

"پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے یہ بھی تمہیں سجھائی دیتا ہے کہ دوسروں کو ہی نصیحتیں کرتے ہو۔"

"کیا ہُوا میرے گھر والوں کو؟" میں دھاڑا۔

"تم ہی جانو۔ لوگ اس گھر کو چکلہ کہتے ہیں۔ تمہاری دادی، باپ اور ماں کو دلال سمجھتے ہیں۔ کیا تم اتنے بچے ہو کہ یہ باتیں نہیں جانتے۔"

زندگی میں جس شخص کا جبڑا سب سے پہلے میں نے توڑا وہ یہی میرا دوست ذاکر تھا۔ وہ تو منہ سے خون پونچھتا ہُوا چلا گیا مگر اس کی بات جیسے کسی نے تیز دھار دار چاقو سے میرے دل پہ لکیر ڈال دی ہو۔ ایسی زہر بھری لکیر جس میں ہمیشہ آگ سی نکلتی رہتی ہو اس آنچ کو جب میں زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ تو میں نے ساری بات امّی کے سامنے اگل دی۔ امّی اطمینان سے بولیں:

"کہنے دو لوگوں کو۔ جس گھر کے لوگ ذرا زیادہ ترقی یافتہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ جب تعلیم عام نہیں تھی تو جس گھر کی لڑکیاں کالجوں میں پڑھتی یا پڑھاتی تھیں وہ چکلہ ہی ہوتا تھا جس گھر کی لڑکیوں نے پہلے پہل پردا چھوڑا، ریڈیو اسٹیشن گئیں یا ڈراموں میں حصّہ لیا وہ آوارہ ہی کہلائیں۔ اب لوگوں نے اس سب کو تسلیم کر لیا ہے مگر فرموں میں سیکرٹری کی جگہ کام کرنے والیاں اب بھی ان کے نزدیک خراب

ہیں۔ تھوڑے دن میں لوگ اس کے بھی عادی ہو جائیں گے۔ تم جانتے ہو تمہاری بہنوں نے یہ کام مجبور ہو کر شروع کیا تھا۔ اب ان کو اچھے پیسے ملتے ہیں۔ ان کی ساکھ ہے۔ اس لیے کچھ لوگ جلتے بھی ہیں۔ مگر تم ان کو بکنے دو۔ لڑتے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ کہتے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔"

امّی کی باتوں سے مجھے تھوڑی سی تسلّی ہو گئی۔ مگر اس دن میں نے ذاکر کی شکل پھر کبھی نہ دیکھنے کی قسم کھا لی۔ اس کی دی ہوئی گھڑی بھی میں نے اتار کر ڈال دی اور وہی پرانی مرمّت شدہ گھڑی دوبارہ لگا لی۔

مذہبی دورہ پڑنے سے چند دن پیشتر میں نے ابو سے کہہ کر خالصتاً اپنے لیے چھوٹی سی ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی لی تھی۔ اب وہ صرف مجھے مسجد تک لانے لے جانے کے کام آتی تھی یا شہر میں کوئی وعظ وغیرہ ہوتا تو وہاں چلا جاتا۔ اس رات ——— کی مسجد میں کوئی بڑا بھاری وعظ تھا۔ ایک خلقت اس کو سننے اکٹھی ہوئی تھی۔ آسمان پر چاند جگمگا رہا تھا۔ میناروں کی ٹیوب لائٹس کی روشنی بھی چاندنی کا سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ وعظ سننے والوں کے سفید کپڑے اس دودھیا روشنی میں ایسے چمک رہے تھے جیسے چاندنی میں بیلے کے پھول اُٹے پڑے ہوں۔ میں اپنی کار میں بیٹھا وعظ سن رہا تھا کہ ایک نو وارد نے دومنٹ مجھ سے بات کرنے کی اجازت چاہی۔ انہوں نے اپنا تعارف حاجی کچھ دین وغیرہ کروایا جو میں اچھی طرح نہ سن سکا۔ ان کی دمکتی سفید ڈاڑھی، چکتی بوسکی کی قمیص اور بڑی بڑی آنکھوں نے مجھے کچھ عجیب سرور سا بخشا۔ لگا جیسے پرانی حکایتوں کے کوئی بزرگ میری کوئی مشکل آسان کرنے آئے ہیں ـــ بات بھی یہی تھی۔ انہوں نے کہا:

"آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ اس عمر میں یہ عبادت یہ استغراق کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ماشاء اللہ۔ جزاک اللہ۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کو حج پر جانے کا شوق ہے۔"

"کس مسلمان کو نہیں ہو گا" میں نے بے اختیار کہا۔

"بے شک بے شک۔ اگر آپ میرا حقیر نذرانہ قبول کریں تو میں آپ کو حج پر بھیجنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

میں بوکھلا یا گیا۔ یہ چاندنی رات، آدھی رات کا سماں، ایسا پاکیزہ ماحول۔ یہ بزرگ اور حج کی پیش کش۔ یا اللہ یہ کون میری دستگیری کر رہا ہے ..... مجھے اور کچھ نہ سوجھا۔ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا اور مجھ پر رقّت طاری ہو گئی۔

وہ بولے: "میں گناہ گار بندہ ہوں، شرمندہ نہ کرو۔ تمہارے جانے کا سارا انتظام ہو جائے گا۔ جس چیز کی ضرورت ہو گی میں آدمی بھیج کر تم سے منگوا لوں گا۔ البتہ یہ بات ابھی کسی سے نہ کہنا۔ دوسروں کے ہاتھ کی بات ہے۔ ہزار رکاوٹیں ہو سکتی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارا جذبۂ صادق ضرور تمہیں وہاں لے جائے گا۔ جب سارا انتظام ہو جائے گا تب دعائے خیر کے لیے میں تمہیں بلواؤں گا۔ تم مجھے حیران ہو کر دیکھ رہے ہو شاید تم سوچ رہے ہو کہ اس کے بدلے ..... ہاں اس کے بدلے تمہیں میرا ایک کام کرنا ہو گا۔ روضے پر جا کر میرے حق میں دعا مانگنا۔ تم جیسے پاکیزہ جوانوں کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ حضور نے فرمایا ہے:

"جوانی کی عبادت بڑھاپے کی عبادت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔"

میں شکریے کے الفاظ بھی نہ کہہ سکا اور وہ فرشتہ صورت و سیرت لمحہ بھر میں اوجھل ہو گئے۔ میں وہاں سے ایک عجیب عالم سرخوشی میں چلا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رنگوں کی پھوٹیں میرے چاروں طرف پڑ رہی ہیں۔ لڑکے بتاتے تھے کہ ایل ایس ڈی کھا کر آدمی ایک عجیب سرور کے عالم میں رہتا ہے۔ ہوا میں پرواز کرنا عین ممکن سمجھتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب اور خوب صورت رنگ اسے نظر آتے ہیں جو ہوش میں تو کیا خواب میں بھی اس نے نہ دیکھے ہوں گے۔ بس میرا یہی عالم تھا۔ جانے کون سے راستے سے کہاں

سے نکلا چلا آ رہا تھا کہ دفعتہً زمین پہ آ گیا۔۔۔۔ ایک گھر کے آگے بڑی سی ایک کار کھڑی تھی اس میں امّی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس میں سے نمبر ۳ باجی اُتریں۔ وہ سفید بنارسی ساری میں ملبوس تھیں۔ بال بال موتی پروئے۔ امّی نے ان کے کان کا جھمکا ٹھیک کیا اور وہ مسکراتی ہوئی اس گھر کے اندر چلی گئیں۔ امّی نے ڈرائیور سے کچھ کہا اور کار چل دی۔

گھر پہنچا تو امّی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا:

"نسرین باجی کہاں گئی ہیں؟"

"اپنی سہیلی کی شادی میں۔"

"اس وقت اکیلی؟"

"نہیں میں خود چھوڑ کر آئی ہوں۔"

"مگر وہاں۔۔۔۔ جس گھر میں آپ نے انہیں چھوڑا وہاں شادی کے تو کوئی آثار نہیں تھے۔"

"تو کیا آپ ہمارا پیچھا فرما رہے تھے؟"

"جی نہیں میں وعظ سُن کر مسجد سے لوٹ رہا تھا۔"

"اچھا تو مُلّا جی سن لیجئے آج اس لڑکی کی شادی نہیں مہندی ہے۔ لڑکیوں نے رات بھر گانے والے کا پروگرام بنایا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے جہاں اسے چھوڑا وہ گھر کے سامنے کا حصّہ نہیں تھا۔ نسرین نے کہا کہ اس طرف سے اس کی سہیلی کا کمرہ نزدیک ہے تو میں نے اسے اُدھر اتار دیا اور کوئی سوال؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ امّی!" میں شرمندہ سا ہو کر چلا آیا۔

ان ہی حاجی صاحب نے میرا پاسپورٹ بنوایا اور سفر سے پہلے کے سارے مراحل طے کروائے۔ یہاں تک کہ احرام بھی انہوں نے ہی بنوایا۔ چلنے سے چند دن پیشتر میں نے یہ راز گھر والوں پہ فاش کیا۔ سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ دادی اماں کفِ افسوس

ملنے لگیں۔ وہ دو دفعہ حج کر آئی تھیں لیکن اگر انہیں معلوم ہوتا کہ پوتا حج پر جا رہا ہے تو کیا وہ یہ سنہری موقع چھوڑتیں۔ میں خوش ہوا کہ پہلے نہ بتایا ورنہ کوئی پیر تسمہ پا بڑی بی کندھے پر سوار ہوں تو حج کا لطف کیا خاک آئے گا۔

چلنے سے ایک دن پیشتر وہ حاجی صاحب پھر مجھے ملے، وہ اسی مسجد میں نماز پڑھنے آئے جس میں میں نماز ادا کرتا تھا۔ واپسی پر وہ میری کار میں بیٹھ گئے اور گھر کے بجائے کسی بھی طرف چلنے کو کہا۔ وہ مجھ سے راستے میں چند باتیں کرنا چاہتے تھے بات بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ انہیں کوئی چیز کسی کو بھیجنی تھی اور وہ میرے ساتھ بھیجنا چاہتے تھے۔

"آپ کو ——" آج وہ تم سے پھر آپ پر اتر آئے تھے۔ "کوئی زحمت نہیں ہوگی وہ شخص خود آکر آپ سے پیکٹ لے لے گا، آپ قطعی کوئی فکر نہ کریں۔ اور اگر وہ واپسی میں کوئی چیز آپ کو دے تو میں خود بہ نفس نفیس آپ کو ایر پورٹ پر ملوں گا۔ کسٹم والے میرے جاننے والے ہیں۔ کبھی جاتا ہوں تو ان ہی کے کمرے میں بیٹھتا ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں اور وہ کوئی ایسی چیز بھیجیں گے بھی نہیں۔ بس یہی . . . وہاں کا کوئی تبرک اس کو لانے میں آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

تبرک لانے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن ان کا انداز اور لہجہ تبرک سے بہت زیادہ اہم کسی چیز کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے کار ایک طرف روک دی اور کہا:

"حاجی صاحب! آپ مجھے حج پر بھیج رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کا اتنا چھوٹا سا کام کرتے ہوئے ہچکچاؤں گا۔ مگر خدارا صاف صاف بتائیے اگر اس پیکٹ میں کوئی قیمتی چیز ہو تو میں اس کی مناسب حفاظت بھی کروں۔ ایسا نہ ہو کہ انجانے میں کہیں میں مارا جاؤں۔"

حاجی صاحب ہنسے۔ بہت میٹھی نقرئی سی ہنسی۔ میرے بازو پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولے:

"صاحب زادے! تم میرے اندازے سے بہت زیادہ عقلمند ہو۔ ہاں تو تم سمجھ گئے۔ بس یہی ذرا سا کام ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں تمہارے لیے قطعی کوئی خطرہ نہیں، نصف فیصد بھی نہیں۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

میں نے کہا:

"بس حاجی صاحب شکریہ۔ میں اس شرط پر حج کرنے کو تیار نہیں، آپ جا سکتے ہیں۔"

میں نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ حاجی صاحب کچھ دیر مبہوت سے بیٹھے رہے۔ پھر کار سے اتر پڑے۔ گھوم کر میری طرف آئے اور بولے:

"تم میرے اندازے سے بہت زیادہ بے وقوف ہو۔ تم سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار تو تمہاری دادی ہیں جنہوں نے مجھ سے کہا تھا:

("بھیا تو مجھے حج کروا دے باقی تیرے لین دین سے مجھے کوئی مطلب نہیں،")

اس کا ثواب عذاب تیری گردن پر۔"

میں جھپٹ کر اترا۔ اس فرشتہ صورت کی سفید نورانی ڈاڑھی والی ٹھوڑی پر ایک مکہ جمایا اور بڑے اطمینان سے کار میں بیٹھ کر گھر آ گیا۔ اس دن کے بعد میں نے گھر کے ہر شخص سے بات کرنی چھوڑ دی۔ گھر کی طرف کا دروازہ کیلیں ٹھوک کر بند کر دیا اور باہر کا دروازہ کھول لیا۔ اس راستے کمرے میں جاتا۔ اسی طرف سے باہر نکل جاتا۔ امی کئی مرتبہ آئیں۔ انہوں نے پوچھنے کی کوشش کی کہ کیوں میں اتنا تنہائی پسند ہو گیا ہوں مگر میں ان کو کچھ نہ بتا سکا دادی بھی آئیں۔ ابو بھی آئے البتہ باجیوں میں سے کوئی نہ آیا۔ آتے جاتے RELIGIOUS FANATIC کا لفظ میرے کان میں پڑتا رہا۔ میرا کھانا کمرے میں رکھ کر چھوڑ دیا جاتا۔ جس وقت دل چاہتا میں ٹھنڈا یا گرم کھا لیتا۔ اگر نہ کھاتا تو دوسرے وقت وہ کھانا اٹھا کر تازہ کھانا رکھ دیا جاتا۔ نوکر مجھ سے قطعی کوئی بات نہ کرتے۔ شاید وہ بھی مجھے پاگل سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس طرح دونوں وقت بنتے کھانا پانی ڈال جاتے جیسے

ٹائیگر کو ڈالتے تھے۔

میں بہت شدت سے یہ گھر چھوڑنے کی سوچ رہا تھا مگر میرا ٹھکانہ کہاں تھا۔ دوستوں سے میں پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔ میں نے سوچا مسجد کے مُلّا سے بات کرتا ہوں۔ خدا کا گھر ہے۔ اس کو بھی کرایہ دینا نہیں پڑتا۔ جب تک کوئی اور انتظام نہ ہو وہاں پڑا رہوں گا مگر مُلّا نے برملا کہا کہ مسجد بھی ایک سلطنت ہے۔ جس طرح ایک سلطنت میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اسی طرح ایک حجرے میں دو مُلّا نہیں رہ سکتے۔ میں نے اسے شیخ سعدیؒ کی ایک گدڑی میں کئی درویش سمانے والی حکایت سنائی مگر وہ بولا کہ یہ وہ زمانہ نہیں۔ چنانچہ میں پھر اپنے گھر کے حجرے میں واپس آیا۔ اب میں نے نماز پڑھنی بھی چھوڑ دی تھی۔ کالج جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن منہ لپیٹے کمرے میں پڑا رہتا یا مجذوبوں کی طرح سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہتا۔ میں سوچتا خدا ایسی خدا پرستی سے بھی دُور ہی رکھے جس میں انسان گناہوں کے طوفان میں اس لیے بہہ جائے کہ اس کا رحم و کرم بے حد و بے کراں ہے۔

پھر ایک دن بالکل ٹی وی کی انگریزی فلموں کی طرح مجھے گھسیٹ کر ایک کار میں ڈالا گیا اور ایک بالکل انجانی جگہ لے جایا گیا۔ جس وقت میں خود کو سینٹ کی طرح ہر آفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ دروازے کا پردہ ہٹا کر وہاں ایک شخص آیا وہ ذاکر تھا۔ میرا پرانا دوست جس کے جبڑے پہ پہلے پہل میں نے مشقِ ستم کی تھی۔ اس کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے مگر آتے ہی اس نے میری ناک پر مُکّہ نہیں مارا بلکہ خاصی نارمل آواز میں بولا:

"تم نے میرے ساتھ زیادتی کی تو میں نے کچھ نہ کہا مگر جس طرح تم اپنی دادی کی توہین برداشت نہیں کر سکتے میں بھی اپنے والد کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر تم نے کہا کہ تمہارے والد اور تمہاری دادی اسمگلنگ کرتی رہی

ہیں۔ اگر ہم نے کہا کہ تمہاری بہنیں پیشہ کرتی ہیں۔ اگر ہم نے کہا کہ تمہاری ماں خود
بیٹیوں کو جگہ پہ جگہ لے کر جاتی ہے تو اس میں ایک لفظ بھی غلط نہیں ہے۔
میں چاہتا ہوں کہ آج تم اس بات کی تصدیق کر لو۔"

یہ کہہ کر اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے ایک کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ کمرے کے پردے کھنچے ہوئے تھے اس لیے پہلی نظر میں مجھے وہاں اندھیرا لگا لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کونے میں رکھے ہوئے پیڈسٹل لیمپ میں کم طاقت کا ایک بلب روشن ہے۔ اس لیمپ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ پلنگ پر ایک لڑکی لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے بدن پہ کچھ نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے چیخ ماری اور تکیہ منہ پہ رکھ لیا۔ میں نے اس کے منہ پہ سے تکیہ کھینچ لیا۔ وہ عروج باجی تھیں۔ بہنوں میں سب سے چھوٹی جو معلوم ہوتا تھا۔ بی اے میں ٹاپ کرنے کی فکر میں ہیں۔ ان کے علم کی پیاس بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ انگریزی پڑھنے ایک لیکچرر کے پاس جاتی تھیں اور فلاسفی پڑھنے دوسرے کے پاس۔ وہ راتوں کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر پڑھنے پر اصرار کرتی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں اس کم بخت گھر میں کوئی ایسی ٹھکانے کی جگہ نہیں تھی جہاں آدمی دو گھڑی سکون کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ لے۔

باجیوں نے امی، ابو اور دادی نے یہ سب بتدریج برداشت کر لیا ہوگا۔ شاید وہ سب آہستہ آہستہ اس خوفناک دلدل میں دھنستے چلے گئے ہوں گے مگر ذاکر اور اس کے حاجی باپ نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ میرے لیے یہ سب کچھ برداشت کر لینے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ شاک، بے حد اچانک اور بے انتہا سخت شاک میں پلا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ اتنی دیر میں وہ پلنگ کی چادر گھسیٹ کر اوڑھ چکی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کا گلا دبا دیا اور پھر لپک کر تکیہ اس کے منہ پہ رکھ دیا۔

جس وقت میں نے دروازہ کھولا وہ باہر سے بند نہیں تھا۔ میرے دروازہ کھولتے

ہی ذاکر اندر آیا۔ مجھے نہیں معلوم اس کے شیطانی ذہن میں کیا تھا مگر عروج باجی کی طرف دیکھتے ہی اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ تیزی سے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا وہ پھر باہر چلا گیا۔ میں سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ مجھے نہیں معلوم، کتنی صدیاں، کتنے زمانے، کتنے جگ بیت گئے۔ اب کے جو شخص اندر آیا وہ حاجی کچھ دین تھا جس کا صحیح نام مجھے آج تک معلوم نہیں ہوا۔ شاید وہ ذاکر کا باپ تھا۔ اس نے بیحد کاروباری انداز میں اندر قدم رکھا۔ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا جیسے میری حالت کا اندازہ کر رہا ہو پھر نہایت سپاٹ لہجے میں بولا:

"تم نے یہ اچھا نہیں کیا مگر خیر اس وقت یہ بحث بے کار ہے۔"

میں نے کہا:

"میں خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے کہا:

"تم ایسا نہیں کرو گے اور اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں تمہیں بچا لوں گا۔ لو یہ پکڑو۔ . . . یہ تمہارا پاسپورٹ ہے۔ یہ دوسرے کاغذات ہیں۔ آج سے تمہارا نام وہ ہے جو اس پاسپورٹ میں درج ہے۔ تم سرحد تک پہنچتے پہنچتے اپنے بال اور داڑھی بڑھا لینا پھر اُس شخص اور تمہارے حلیے میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ ہم ایسے سینکڑوں پاسپورٹ چلاتے رہتے ہیں۔ تم اپنی گاڑی چھوڑ جاؤ۔ باہر ایک اور کار کھڑی ہے تم وہ لے جا سکتے ہو۔ یہ اس کی چابی ہے اور یہ بٹوہ اس میں پیسے ہیں۔ تم طورخم پر سرحد پار کر کے افغانستان جا سکتے ہو اور پھر تمہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ افغانستان میں تمہیں جس جگہ جانا ہے اس کا پتہ بھی بٹوے میں موجود ہے۔ میں تم سے وہیں رابطہ قائم کروں گا۔ نعش کی تم فکر نہ کرو۔ . . . وہ سب ٹھیک ہو جائیگا۔"

میں بے ہوش نہیں تھا مگر ہوش میں بھی نہیں تھا۔ شاید ٹرانس میں تھا۔ وہ مجھے پکڑ کر کار تک لایا۔ کار میں بٹھایا۔ چابی گھمائی اور کہا:

"بس اب چلے جاؤ۔ دیر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہائی وے سے چلے جاؤ وہاں گاڑی تیز چل سکتی ہے۔ مگر ابھی کچھ دیر آہستہ چلانا، تم ہوش میں نہیں ہو"

عامل کے حکم پر جس طرح معمول کام کرتا ہے۔ میں نے کلچ پر پاؤں رکھا اور کار گیئر میں ڈال دی۔

دریا کے پار ٹین کی مسجد کے مینار سے اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ کالے بادلوں کے سائے میں اونچی نیچی پگ ڈنڈیوں پر چند مقامی لوگ کندھے پر چادریں ڈالے نماز کے لیے جا رہے ہیں۔ آس پاس کوئی جھولتا ہوا پل نظر نہیں آرہا ہے مگر اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس زم زم دوب پر بھی نماز پڑھ سکتا ہوں۔ مقامی لوگوں کو تھوڑی سی حیرت ہی ہو گی کہ جسے وہ غیر ملکی سمجھ رہے تھے اور سارے غیر ملکی ان کے لیے انگریز یا امریکن ہوتے ہیں اور کافر، وہ تو مسلمان نکلا۔ نہیں یہ ان کا ڈر نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کا یہ نیا لینڈ سلائیڈ میرے عقیدے کو روندتا ہوا گزر گیا ہے۔ میں ایسی نمازوں سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں جو حاجی پڑھتا ہے جو میری دادی اور میری ماں پڑھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ خدا اب مسجود نہیں رہا۔ وہ حضوری باقی نہیں رہی۔ وہ اب ایک جج ہے۔ انسان جج سے انصاف کی توقع کرتا ہے اس کے سامنے ماتھا نہیں ٹیکتا۔ اگر وہ سچا جج ہے تو آپ سے آپ انصاف کرے گا۔ گھٹنے ٹیک کر انصاف کی بھیک مانگ کر اپنی قدر گرانے سے فائدہ.....

دوسرے دن ایک چھوٹی سی جگہ سے میں نے کراچی سے چھپنے والا ایک اردو

اخبار خریدا۔ اس میں میری اور عروج باجی کی تصویر تھی اور ہماری کار کی جو پیراڈائز پائینٹ پر لاوارثوں کی طرح کھڑی تھی۔ پولیس کو وہ اسی جگہ ملی تھی۔ مگر ہم دونوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ قیاس تھا کہ ہم دونوں پکنک کے لیے یہاں آئے، پانی میں اترے اور جیسا کہ کئی سال سے برابر ہو رہا ہے پانی کے درمیان چھپے ہوئے خطرناک گڑھوں میں خود کو سنبھال نہ سکے اور بہہ گئے۔ کوشش کے باوجود ہماری لاشیں نہ مل سکیں۔ خیال ہے کہ شاید ہمارے ساتھ کچھ اور لڑکے لڑکیاں بھی ہوں۔ اخبار میں اپیل کی گئی تھی کہ اگر ایسا تھا تو ہمارے ساتھی سامنے آئیں اور اس حادثے پر روشنی ڈالیں۔ میں حاجی اور نواکر کی چالاکی پر حیران رہ گیا۔ ایک چھوڑ دو آدمیوں کو کتنی آسانی سے انہوں نے سمندر میں بہا دیا تھا۔ ہمارے ہاں اوّل تو ویسے ہی کون سی بڑی بھاری تفتیش ہوتی ہے۔ اگر کوئی کرنے پر تُل ہی جائے تو حاجی جیسے لوگوں کے پاس ان کا منہ بند کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ گھر والوں کو اصل بات بتا کر بھی خاموش کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں بیٹے کے ہاتھوں بیٹی کی موت پر وہ منہ نہ سئیں گے تو کیا اسے اَلَم نَشرح کریں گے۔ افوہ، ہمارے ہاں کیسے کیسے اعلیٰ دماغ اور اختراعی ذہن موجود ہیں۔ کیا دنیا میں بہت کچھ کرنے والے ان سے زیادہ ذہین ہوں گے۔ ...... فرق صرف اتنا ہی تو ہے کہ ہمارے ہاں کے لوگوں نے جب بھی کوئی اعلیٰ بات سوچی کجروی اس میں شامل رہی۔ ذہنیت مجرمانہ رہی۔ اگر یہی لوگ ملک کے لیے کوئی مثبت کام کرنے کھڑے ہو جاتے تو ......

تو اب سجاد عظیم مر چکا ہے۔ سمندر میں بہہ کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہے۔ اب صرف ٹیلر اسمتھ باقی ہے جو انگلستان کا رہنے والا ہے اور سیاحت کے لیے پاکستان آیا ہوا ہے۔ اس کے بال بھورے، آنکھیں بھوری، رنگ سفید، قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور دائیں گال پر ایک تل ہے۔ دائیں گال پر تل یا کوئی ہلکا سا نشان

میرے بھی موجود ہے جسے تِل بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ تو اب میں ٹیلر اسمتھ ہوں اور چاہوں تو افغانستان کے راستے انگلینڈ تک جا سکتا ہوں۔ میں نے راستے میں بال اور داڑھی بڑھالی ہے۔ میں خواہ مخواہ بھی بڑے شہروں سے بچ کر نکلتا ہوں اور گاؤوں میں اپنے پیٹ کی دوزخ بھرتا ہوں۔ لوگ مجھے غیر ملکی سیّاح ہی سمجھ رہے ہیں۔ جن میں سے اکثر ویسے بھی سنکی ہوتے ہیں۔ کم از کم ہمارے گاؤں والوں کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ مجھے انگریز مارکہ اردو بولنے کی اچھی خاصی مشق ہو گئی ہے۔ پنڈی سے پشاور جاتے ہوئے میں اپنا ارادہ بدل لیتا ہوں اور پشاور جانے کے بجائے سوات کی طرف مُڑ جاتا ہوں۔ آخر میں ایک غیر ملکی سیّاح ہوں اور سوات دیکھے بغیر پاکستان کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ سیدو شریف میں میں کسی ایسے ہوٹل میں میں نہیں ٹھہرا جہاں غیر ملکی ہوں۔ میں ان کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں انگریزوں کے لہجے میں انگریزی نہیں بول سکتا اور میں انگلستان کے بارے میں سوائے روایتی باتوں کے اور کچھ نہیں جانتا۔ میں وہاں ایک ایسے معمولی ہوٹل میں ٹھہرا جس کے باہر لکھا تھا:

"رہائش کا اعلیٰ انتظام۔"

اور اس سے بھی جلی حروف میں درج تھا: "فلش سسٹم"

مجھے معلوم تھا کہ ایسے ہوٹلوں میں صرف سسٹم ہوتا ہے فلش نہیں ہوتا کیونکہ پانی بالٹیوں میں بھر کر دریا سے لایا جاتا ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے غیر ملکیوں کو بڑے بڑے تھرڈ کلاس ہوٹلوں بلکہ بان کی چارپائیوں والی سراؤں میں سوتے دیکھا ہے۔ اسی لیے میرے ایسے ہوٹلوں میں ٹھہرنے سے کسی کو تشویش نہیں ہوئی۔

میں وادیٔ سوات کے آخری سرے تک ہو آیا ہوں۔ کالام سے بارہ میل آگے ایک جگہ جہاں دریا اور سڑک ایک ہی سطح پر برابر برابر لیٹے ہوئے تھے۔ میرا جی

چاہا میں یہیں رہ پڑوں۔ پیڑ کا سایہ سر پر، پاؤں برف سے پانی میں اور ایک قدم پر سڑک۔ یہ ایسا منظر تھا جو ہر جگہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ دریا کی سطح اتنی ہموار تھی کہ پانی گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا اور چند قدم پر پتھروں سے سر ٹکراتا اتنا پُر شور بھی معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ پاگل ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے جھاگم جھاگ ہو رہا ہے۔ کیوں نہ یہیں کسی ایسے پیڑ کے سائے میں ایک جھونپڑا ڈال لوں جس کی جڑیں پانی میں ہوں اور شاخیں سڑک پر۔ اس سڑک پر ترقی یافتہ دنیا سے کم ہی کوئی آتا ہے مگر آجکل کہیں بھی جھونپڑی ڈال کر رہنا آسان نہیں، غیر ملکی کو دیکھ کر اخبار نویس آ دھمکیں گے۔ چلو اس بہانے اخبار کے خرچ پر سوات کی سیر ہو جائے گی۔ یہ ہفت روزے خدا ان سے بچائے۔ ان کو لوگوں سے انٹرویو لینے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ جا کر میرے اور عروج باجی کی موت پر گھر والوں سے انٹرویو لے آئے۔ حسن ابدال کے بس اسٹینڈ کے ایک سٹال سے میں نے یہ ہفت روزہ خریدا تھا۔ اُف کیا غلط بیانیاں تھیں اس میں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہ میری دادی اماں، میرے ابو، میری امی اور میری باجیاں اتنے زبردست جھوٹ بول سکتی ہیں اور اتنی بے داغ ایکٹنگ کر سکتی ہیں۔ میں ان کے اس ہنر پر عش عش کر اٹھا تھا۔ مجھے خود شک ہونے لگا تھا کہ میں اور عروج باجی دو معصوم فرشتے تھے جو راہ بھول کر اس گھر میں پیدا ہو گئے تھے اور بظاہر ہمیں اتنی جلدی اٹھا لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی سوائے ہماری پاکیزگی اور فرشتہ سیرتی کے۔ میں نے وہ رسالہ اسی وقت دریا میں بہا دیا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اب کیا کروں۔ میں کہیں ٹک نہیں سکتا یہ بات طے ہے۔ میرے مقدر میں منزلیں نہیں صرف راستے ہیں۔ سیدھے سپاٹ راستے اونچے نیچے راستے اور پُر پیچ راستے۔ ابھی سے میری زندگی اتنی دشوار ہو گئی ہے تو آگے کیا ہو گا۔ کیا میں اس زندگی کو از سرِ نو شروع کرنے کی ہمت رکھتا ہوں۔ کیا نام اور شخصیت بدل جانے کے بعد میں اس ملک میں رہ سکتا ہوں؟ میں اس ملک سے باہر

جانا نہیں چاہتا۔ کسی نئے ملک میں جا کر میں کیا کروں گا۔ جہاں کوئی چڑیا کا بچہ بھی مجھے نہیں جانتا۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں بھی میں اپنے عزیزوں اور جاننے والوں میں سے کسی کے پاس نہیں جا سکتا مگر اب اس کا کیا ہو کہ اپنے دیکھے بھالے دیس کی ہر مٹی آشنا ہر گلی جانی پہچانی، ہر شخص دوست سا لگتا ہے۔ میں ان کے لیے بدلیسی بنا ہوا تھا۔ مگر میں انہیں خوب جانتا تھا۔ میرے دیس کے یہ محنتی بھولے بھالے لوگ غیر ملکیوں کو بھی ایک لوٹا لسّی اور مٹھی بھر مکئی کے دانوں سے کبھی محروم نہیں کریں گے۔ چاہے میں کسی گھر پہ دستک دوں۔ ایسے میں افغانستان میں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں جا کر کیا کروں گا۔ مگر میں بے نام و نشان کب تک پھروں گا۔ ہر شخص ایک نام چاہتا ہے اس نام سے وابستہ کوئی جگہ چاہتا ہے۔ اگر میرے لیے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں ہے تو کہیں تو ہوگی۔ مگر میں سرحد پار کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اگر وہاں کسی کو میرے پاسپورٹ پر شک ہو گیا تو۔ اپنے ملک سے باہر جانے کی کوشش کرنا ایسے سمندر میں چھلانگ لگانا ہے جہاں شروع سے اخیر تک خطرہ ہی خطرہ ہے۔ پھر وہ حاجی جو میرے راز کا محرم ہے کیا مجھے چھوڑے گا۔ اگر میں افغانستان نہیں پہنچا تو وہ مجھے یہاں تلاش کرے گا۔ اس سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گیا تو اس پاتال تک پہنچوں گا جس سے نکلنا ناممکن ہوگا۔

پھر میں کیا کروں۔ میرے لیے کیا چارہ ہے کیا اس مشکل کا کوئی حل نہیں ہے ایک بہت اچھا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ کیوں نہ اسی جگہ سے کار سمیت کود پڑوں جہاں سے چند سال پیشتر ایک پوری بس دریا میں گر کر میلوں بہتی چلی گئی تھی۔ اس جگہ کو ڈھونڈنے میں کوئی دقّت نہیں ہوگی کیونکہ اب وہاں حادثے میں مرنے والوں کی یاد میں ایک بورڈ لگا دیا گیا ہے۔ کار لے کر کودنے کے لیے وہ بے مثال جگہ ہے سینکڑوں فٹ سے کار سیدھی پتھریلے دریا ہی میں گر سکتی ہے کیونکہ راستے میں اُدر

گوئی روکاوٹ نہیں ہے۔ اتنے اوپر سے گرنے کے بعد کار کے یا آدمی کے بچ جانے کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے۔ سجاد عظیم کے مرنے کے بعد اب ٹیلرا سمتھ کو بھی مر ہی جانا چاہیے جبکہ دنیا میں اس کے لیے کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

اب میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔ میں کوئی وصیت نہیں چھوڑنا چاہتا، کوئی انکشاف نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی اعتراف نہیں کرنا چاہتا ان کاغذوں پر جو کچھ میں نے لکھا ہے، میرے اور کار کے ساتھ یہ بھی جل کر راکھ ہو جائے گا یا دریا کے پانی میں مل کر نیست و نابود ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ میری زندگی کا آخری پڑاؤ ہے اور وہ حادثہ آخری لینڈ سلائیڈ ہوگا۔ چھوٹی لڑکی ایک اپنے سے بھی چھوٹی لڑکی کو لے کر آگئی ہے۔ دونوں مجھے حیرت اور خوشی سے دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے مکئی کے بھنے ہوئے دانے میری طرف بڑھائے ہیں جو میں نے بڑے شوق سے لے لیے ہیں۔

لینڈ سلائیڈ کو دبا کر، پچکا کر، موٹے پتھروں کو ہٹا کر قابلِ گزر بنا دیا گیا ہے۔ ایک ایک کر کے گاڑیاں چھینٹے اڑاتی اس پر سے گزر رہی ہیں۔ لوگوں کے چہرے مارے خوشی کے سرخ ہوئے جا رہے ہیں۔ جیسے وہ جیل سے چھوٹ کر جا رہے ہوں۔ سب کو کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی ہے مگر مجھے کہیں جانا ہی نہیں ہے۔

ساری گاڑیاں گزر گئی ہیں۔ اب دوسری طرف سے بھی بسیں اور کاریں آنا شروع ہو گئی ہیں۔ لوگ حیران ہیں یہ کون پاگل ہے جو سڑک ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی اخروٹ کی چھاؤں میں بیٹھا مکئی کے دانے چبا رہا ہے۔ غیر ملکی خبطی سیاح۔ مگر میرا خیال ہے کہ نہ میں غیر ملکی ہوں اور نہ سیاح۔

میں خبطی بھی نہیں ہوں۔ میں تو ایک بے نام منزل کا بے سمت مسافر ہوں، اپنے سفر کے لیے ہمت باندھ رہا ہوں...... مرنا اتنا آسان بھی تو نہیں ہے۔

آگ اور پانی

"ہیئے ہیئے، کیسی چمک تھی خدا خیر کرے۔" ممانی نے سر پر دوپٹہ یوں اوڑھا جیسے آسمان کے بادلوں کو ڈھانپے دے رہی ہوں۔ گرج ہونے سے پہلے ہی ساری لڑکیوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئیں۔ سب کے رنگ زرد پڑے ہوئے تھے جیسے بجلی پولیس کی طرح ان کا پیچھا کر رہی ہو اور کوئی دم میں انہیں آ لینے والی ہو۔

"اللہ خیر" نانی کے خراب کانوں میں بھی بادلوں کی گرج پہنچ ہی گئی۔

"چلئے بھائی جان پتا، ادھر دیکھئے باہر کی طرف دیکھیں گے تو اور وحشت ہوگی"

"ابھی پانچ بج رہے ہیں۔ خبریں لگاؤ۔" جنگ کے دنوں کی طرح بارش میں بھی خبریں فرض کی طرح اہم ہو گئی تھیں۔ ٹرانزسٹر بیچوں بیچ رکھ دیا گیا اور سب خبریں سننے لگے تاش کھیلنے والوں نے اتنی دیر کے لیے ہاتھ روک لیا۔

"قصرِ المین" کے الگ الگ حصوں میں رہنے والے سارے رشتے دار اختلافات

پس پشت ڈال کر اس وقت ملک پر وقت پڑنے والے باسیوں کی طرح متحد اور یک جا تھے۔ بے پناہ بارش کی وجہ سے کراچی کو "آفت زدہ علاقہ" قرار دے دیا گیا تھا مگر قصرِ امین میں رہنے والوں کے لیے آفت زدہ علاقہ اگر کوئی تھا تو وہ ان کی محل نما کوٹھی تھی جس میں یہ طوفانی بارش بھی اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ آنکھوں والے ہوتے تو اسی کو دیکھ خوش ہوتے مگر وہاں تو مردوں سمیت ایکو ایک بلا کا ڈرپوک تھا۔ یوں تو چوہوں اور چھپکلیوں سے بھی ڈرتے تھے مگر جتنا ڈر ٹپکے کا تھا اور کسی چیز کا نہیں تھا۔ اور اپنی کوٹھی یا گھر والوں سے آگے تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ خبروں میں ہوا کے دباؤ کے ساتھ جب بارش کی پیشین گوئی کی گئی تھی تو ایک ساتھ اَن گنت آوازوں نے کہا: "ہائے اور بارش۔"

"یا اللہ خیر" ممانی نے دوپٹہ سر پر اچھی طرح لپیٹا۔

"ہاں ہو گی۔ آثار کہہ رہے ہیں۔" خالو کی عادت تھی کسی بات کی تصدیق ہو جانے کے بعد اسے یوں بے نیازی سے دُہراتے جیسے برسوں پہلے پیش گوئی کر چکے ہیں۔

"کیا ہُوا، کیا کہا — ؟" نانی دور تخت پر سے پُکاریں۔

"اور بارش" لڑکیاں چلّائیں۔

"یا مولیٰ! اب تو رحم کر اپنے محبوب کے صدقے یا دنیا کو ڈبو کر چھوڑے گا۔"

"ڈوبے گی دنیا اگر گناہوں کا یہی عالم رہا۔ خدا مسلمانوں کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ اب بھی ہوش میں آجاؤ۔" ممانی ہر وقت کے تاشوں سے بے حد نالاں تھیں "دیکھ لو ہر اسلامی ملک پر آفت آئی ہوئی ہے۔ کہیں جنگ، کہیں زلزلے اور کہیں بارشیں" وہ بڑی باقاعدگی سے "جنگ" کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ حال ہی میں ترکی میں پھر زبردست زلزلہ آیا تھا اور مشرقِ وسطیٰ پر جنگ کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے مگر دراصل

وہ ان چیزوں سے اتنی پریشان نہیں تھیں جتنی گھر میں ہونے والے تاشوں سے۔

"اے ہے سلمان کدھر ہے، آیا کہ نہیں ابھی تک۔" نانی بولیں۔

"کوئی بھی نہیں آئے۔"

"ہے ہے موئی اسے اپنی امان میں رکھیو۔ سڑکیں کتنی پھسلنی ہوگئی ہیں اور وہ اندھا دھند گاڑی چلاتے ہے۔" نانی بے چاری کو کیا پتہ کہ سڑکیں پھسلنی نہیں ہوئی ہیں بلکہ نہروں میں تبدیل ہوچکی ہیں۔

"آگئے ہیں کب کے اپنے کمرے میں لیٹے ہیں۔" سو کھے اچھور ملازم نے اپنے خاص چڑچڑے انداز میں اطلاع دی۔

"اللہ تیرا شکر! دلہن اسے جاکر دیکھو، دشمنوں کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کہیں بارش میں بھیگا نہ ہو۔ کپڑے بدلوا دینا۔"

"چائے بنوا دو۔" ممانی بولیں۔

اجمل برآمدے میں کھڑا یہ ساری لے دے بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سلمان بھیا چیونٹی کی رفتار سے کار لیے کبھی کے واپس آکر اپنے کمرے کے پردے کھینچ اوندھے منہ پڑے تھے اور بیٹھک کے پردے برابر کرکے باقی سب ایک جگہ اس لیے جمع تھے کہ ایک دوسرے سے ذرا حوصلہ رہے۔ مرد بیچارے تاش صرف اس مارے کھیلتے تھے کہ ذرا دھیان بٹا رہتا تھا۔ بارش کی تڑاتڑ اور گرج ذرا دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اجمل نے ابھی سر سے پیر تک شرابور کپڑے تبدیل کیے تھے اور وہ برآمدے کی بے حد سرسبز بیلوں میں گیلی چڑیوں کو پناہ لیتے دیکھ رہا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے کا چوڑا نالہ پُر ہوکر بہہ نکلا تھا۔ اور اب پانی گیٹ سے اندر داخل ہوکر صحن میں بھر رہا تھا۔ چھوٹے گملے پانی میں ڈوب چکے تھے۔ صرف پودوں کی سب پھنگیں باہر نکلی رہ گئی تھیں۔ گھر کی کرب بہت

اونچی تھی۔ گھر کے اندر پانی آجانے کا خطرہ نہیں تھا۔ اسی اطمینان کے پیش نظر اس نے گھر والوں کو اس خبر سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ سب کے ایک ساتھ بے ہوش ہو جانے کا ڈر تھا۔ پانی ٹپاٹپ برسے جا رہا تھا۔ بجلی رہ رہ کر یوں چمک رہی تھی جیسے ہلکے نیلے رنگوں کی ٹیوب بار بار جل بجھ رہی ہو۔ ہر طرف گرتے پرنالوں کا بے پناہ شور تھا مگر اس شور سے کم تھا جو وہ لیاری ندی کے بہاؤ پر دیکھ کر آیا تھا۔ لیاری ندی اپنی آغوش میں سوئی ہوئی جھگیوں کو اس طرح بازوؤں میں سمیٹے اُبل کر بہہ نکلی تھی کہ کناروں پر ٹکی ہوئی ساری جھونپڑیاں بھی بہہ گئی تھیں۔ لوگ اپنی جانیں بچا کر بھاگے تھے اور اونچی عمارتوں اور اسکولوں میں پناہ لی تھی۔ پُل کے دونوں کناروں پہ یہاں سے وہاں تک جھکے ہوتے مرد ندی میں بہتی ہوئی اپنی جھونپڑیوں کی زیارت کر رہے تھے۔ ان کے ننگے بدنوں پر بارش کی بوچھاڑ بے اثر تھی اور گرج چمک کا تو انہیں احساس تک نہیں تھا۔ اس لیے کہ فکر کرنے کو اور بہت سی باتیں تھیں۔ کپڑے بہہ گئے، بچھونے بہہ گئے، راشن بہہ گیا۔ تو لیے ٹین اور ڈبے تیرتے ہوئے چلے گئے۔ کاٹھ لگی سیاہ جھولتی چارپائیاں چلی گئیں، میلے چیکٹ چھلنی بنیان اور تہمد چادریں بہہ گئیں۔ کبوتروں کے کابک اور ان کے اڈے بہہ گئے، غرضیکہ ان کی زندگی کی ہر ضرورت اور ہر آسائش بہہ گئی تھی اور وہ پل پہ جھکے یہ تماشہ ایسے مزے سے دیکھ رہے تھے جیسے کشتیوں کی دوڑ یا پیراکی کا مقابلہ دیکھ رہے ہوں یا ٹنوں وزنی اس مچھلی کا نظارہ کر رہے ہوں جو کراچی کے سمندر میں کبھی کبھی آنکلتی ہے۔

ہلکے سبز رنگ کی ننھی سی چڑیا ایک شاخ سے پھدک کر دوسری پر آبیٹھی اور اجمل کی طرف بے یقینی سے دیکھنے لگی۔ کیا خوب صورت چہرہ تھا بالکل اس چڑیا کی طرح بھولا اور معصوم۔ اسی کی طرح گیلی اور سہمی ہوئی، گیلے بالوں کی بکھری ہوئی لٹیں اور آنکھوں میں بہتا ٹپکتا پانی، مڑی ہوئی پلکیں اور سرخی کی حد کو چھوتے ہوئے گلابی

ہونٹ۔ گالوں پہ پانی کی بہتی بوندیں اور آنکھوں میں ہلکی سی وحشت۔ بالکل ہرنی کی طرح بھڑکی تھی۔ جب اس نے ہاتھ پکڑ پانی کے گڑھے سے نکالا تھا۔ سنا ہے ہرنیاں بھی آہستہ آہستہ رام ہو جاتی ہیں مگر یہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ امّی اور بہنیں تو بڑی بڑی کوٹھیوں میں رشتے ڈھونڈھ رہی ہیں۔ بارش سے پہلے یہ مہم خوب زوروں پہ چل رہی تھی جب بھی وہ کوٹھیوں سے گلاب، جامن، کیک اور پھلوں سے پیٹ بھر کر لوٹتیں تو ان کے منہ لٹک رہے ہوتے۔ اترتے ہی امّی کہتیں:

"اچھی شکل کی لڑکیاں تو اڑ گئی ہیں کراچی سے .... بہنی سب کچھ ہے مگر لڑکی کسی کام کی نہیں۔ اتنا بڑا اوماں اللہ میری توبہ اور رنگ .... رنگ کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔"

اس کے بعد لڑکی کے گھر اور ان کی خاطر داری کی تعریف شروع ہوتی۔ اجمل سوچتا تھا اگر کوئی چٹوری عورت چاہے تو اس شہر کراچی میں لڑکیاں دیکھنے کے بہانے سال کے تین سو پینسٹھ دن موج کر سکتی تھی۔ اجمل نے خود کبھی بھی کسی پری کے خواب نہیں دیکھے تھے مگر گھر میں ہمہ وقت یہی چرچا تھا کہ بہوئیں خوبصورت ہونی چاہئیں۔ یہاں تک کہ ابّا کہتے تھے اور کچھ نہ ہو رنگ تو گورا ہو کالے بچے تو بھئی ہم سے ایک منٹ کو برداشت نہ ہوں گے اور واقعی انہوں نے زندگی بھر کبھی کسی کالے آدمی کو برداشت نہ کیا تھا۔ گھر کے لوگوں کی اور بات تھی۔ اور اب تو اجمل کو بھی شک ہو چلا تھا کہ کراچی سے گورا رنگ یوں اڑ گیا ہے جیسے بازار سے اصلی گھی لیکن اس نے کیا دیکھا تھا۔ آفتاب یا ماہتاب۔ منورہ پہ ایک کلرک جو ہر آنے جانے والے کو اپنی زندگی کی داستان سنانے کا شوقین تھا۔ اس سے ایک دن یوں گویا ہوا تھا:

"ارے اپنی شادی بھی عشق کی شادی تھی۔ ایک دن فٹ بال کھیل کے آیا تھا۔ بنیان پہنے پلنگ پر لیٹا تھا۔ سامنے جو نظر

اُٹھی تو کیا دیکھا وہ ماہتاب ۔ بس اسی وقت اماں کے پاس گیا اور کہا اسی سے شادی کراؤ بڑے ماہتاب سے ۔ اماں نے مجبور ہو کر رشتہ بھیجا تمہاری بھابی کا ابا تھا مولوی، بولا "تمہارا لونڈا اُچھا پہنتا ہے ۔ یہ شادی نہیں ہوسکتا ۔ بس یار اپن کی جان پر بن گئی ۔ کسی چیز کا ہوش نہیں تھا بھئی ۔ گھر سے جاتا ایک باغ میں لیٹ جاتا ۔ لڑکا لوگ پاگل سمجھ کر پتھر مارتا ۔ یہ دیکھ کر ہمارا ابا ایک دن مولوی کے پاس گیا اور بولا :

سالا ہمارا بیٹا مر جائے گا تمہارا کیا جائے گا ۔ ایک نمبر ہمارا بیٹا ہے گھبرو فٹ بال کا کھلاڑی، نمبر ون چیمپئن ہے سالا، پتہ نہیں کیا کیا بولا ۔ آخر داڑھی والا بڈھا مان گیا اور یوں اپنی شادی ہُوا تمہاری بھابی سے ۔ کبھی آ کر دیکھو ایک نمبر ماہتاب ہے اب بھی " اس سیاہ فام بھینگے کلرک کو ماہتاب میسر آسکتا ہے تو کیا وہ ایسا گیا گزرا ہے ...... ایک دن امی نے جل کر کہہ دیا تھا :

"بس جی ! اب زیادہ دیر کرنی مناسب نہیں ۔ قسمت میں گوری لڑکیاں نہیں تو کیا کریں اور تو سب کچھ ہے ۔"

ابا نے اور بھی جل کر کہا تھا :

"نہیں چاہیئے ہمیں کچھ بھی ۔ بس گورا رنگ چاہیئے اچھی شکل چاہیئے ۔"

"لو اور سنو کسی جاہل کبڈ کو لے آئیں گے ؟"

"ہاں " ابا نے غصّے میں تنتناتے ہوئے کہا تھا ۔

"جھونپڑی والی کر لائیں گے ۔"

"ہاں " ابا نے گردن اور بھی تان لی تھی ۔

"تو بسم اللہ ـــــ میں تو آج کے بعد کہیں جاؤں گی نہیں لڑکی دیکھنے آپ

کو جو راہ چلتی گوری بھکارنیں نظر آئیں لے آئیں دیکھو میرے بیٹوں کا گھر بساؤ۔"

"لے آئیں گے ہم۔" اب ابا کے نقشوں میں صرف مار دولت لگانے کی کمی تھی۔ اجمل دل ہی دل میں اپنے ابا اور امی کی باتوں پر خوب ہنستا تھا۔ سارا دن ان میں یونہی بچوں کی طرح چونچیں چلتی تھیں۔ کیا مجال جو کبھی ایک بات پر متفق ہو جائیں۔ ایک پورب کی کہتا تو دوسرا پچھم کی۔ اب اگر وہ اس مہتابی کا ذکر ابا سے کر دے تو امی سے بحث کی اور بات ہے اسے معلوم تھا کہ امی تو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بات مان بھی لیں گی مگر توپ و تفنگ تک بات تو ابا ہی پہنچائیں گے۔ اکثر وہ کوئی چیز لا کر ابا سے کہا کرتا تھا۔ "ابا یہ لایا ہوں۔"

"کیا ہے بھئی؟"

"پتلون کا کپڑا ہے۔"

"کس کے پیسے؟"

"اپنے پیسے لایا تھا آپ کو پسند ہے تو آپ لے لیجئے۔"

"واہ واہ بھئی بہت اچھا ہے۔ ہمارے کس کام کا اپنی بنواؤ خوش رہو۔"

اسی طرح اگر ایک دن چپکے سے ماہتابی کو لا کر کھڑا کر دے اور کہے ابا یہ لایا ہوں مگر جی توبہ کرو ابا ایک دم بپھر جائیں گے۔ کیا کہا... گھر نہ در..... اچھا تو اب ہم جھونپڑیوں میں برات لے کر جائیں گے۔ صاحبزادے اس گھر سے منہ کالا کرو اور خبردار جو کبھی ادھر کا رخ کیا...... اگر وہ اتنی معصوم ہی نہ ہوتی۔ الو کو کچھ معلوم ہی نہیں کہ دنیا کیا ہوتی ہے۔ دنیا والے کیا ہوتے ہیں۔ اپنے اوپر غضب کا اعتماد مگر یہ لاعلمی کا ہے جیسے ہارڈی کی ٹیس بے چاری کو تھا کس بلا کی خراب ہوئی بے چاری کی زندگی ایک انجانے جانتے کے پیچھے۔ اگر کسی دن اس کو بھی کوئی اس نہج کا مل گیا اور مل ہی جائے گا۔ ایسے لوگوں کی کیا کمی ہے۔ بدبخت اگر اتنی حسین ہی نہ ہوتی

تھوڑی سی کالک ہی مل لیا کرے اپنے چہرے پر۔ ذرا سی مٹی ہی تھوپ لے۔ ماں بھی تو اتنی سیدھی ہے اسی کو معلوم ہوتا کہ وہ کیا موتی کھلے خو۔ اِنے چہروں کے ولیس میں لیسے بھر رہی ہے۔ کل جو وہ گیا ہے تو کملی چارپائیوں پر لوگ کیسے فراغت سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ کسی کو کوئی کام ہی نہ تھا کرنے کو۔ ٹپ ٹپ کرتی بارش میں سب بڑے بیٹھے اپنے ماضی کو رو رہے تھے۔ اور وہ پاس کے ادھ بنے کمرے کی بغیر پٹ اور شیشوں کی کھڑکی میں دو چار ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہاتھ باہر نکالے بوندیں پکڑنے کی کوشش میں کِھل کِھل ہنس رہی تھی۔ ایک بوڑھا مجذوب بارش میں بھیگا ہوا بنا پیا یہ چلاّ اٹھا تھا:

"دیکھو دیکھو کراچی میں کیسی آگ لگی ہے۔ چاروں طرف آگ ہی آگ ہے زمین آگ اگل رہی ہے، آسمان سے آگ برس رہی ہے۔"

وہ چاروں طرف اشارے کر کے بڑبڑائے جا رہا تھا۔

"ارے بڑے میاں! یہ آگ ہے یا پانی؟" کسی منچلے نے اسے چھیڑا۔

"لو دیکھو چاروں طرف پانی ہے اور بڑے میاں کو آگ نظر آ رہی ہے۔ ارے آگ ہوتی تو اس پانی سے بجھ نہ جاتی۔"

بڑے میاں نے اس کی بے وقوفی پہ قہقہہ لگایا اور تمسخرانہ انداز میں کہا:

"آگ پانی سے کہاں بجھتی ہے میاں۔ جب آگ لگتی ہے تو پھر کسی چیز سے نہیں بجھتی۔ سب کچھ خاک کر کے ہی بجھتی ہے۔ راکھ ہو کر ہی بجھتی ہے۔ ...... اُف اُف دیکھو کیسی آگ لگی ہے۔

جھل مل کرتی لڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے بڈھا پھر اپنی بڑبڑاہٹ میں گم ہو گیا۔

"پانی، ہونہہ پانی سے کیا ہوتا ہے۔ پانی نے کسی محل، کسی کوٹھی، کسی بنگلے کو گرایا؟ ...... یہ آگ ہے جو جھونپڑیوں اور محلوں میں تمیز نہیں کرتی

..... یہ جب جلانے پہ آتی ہے تو سب کو جلاتی ہے۔ آگ انصاف پسند ہے ..... پانی بے انصاف ہے، غریبوں کو ڈبوتا ہے، غریبوں کو بہاتا ہے ..... ارے دیکھو کیسی زبردست آگ ہے۔"

بوڑھے مجذوب کی باتیں سن کر اجمل کا دل خوف سے منجمد ہونے لگا تھا۔ مہتابی بھی ڈر گئی تھی۔ اس کا دھیان بٹانے کے لیے اجمل نے کپڑوں کی گٹھڑی اس کی طرف بڑھائی تو اس نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے پیچھے کر لیا اور کہا:

"اماں کو دے دو یا نہ دے دو بھی اس نے نہ کہا جیسے لینے دینے کی بات منہ سے نکالتے ہی اسے تکلیف ہوتی ہے۔ لوگ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ بھاگوان کہاں سے کپڑوں کا گٹھڑ لایا ہے۔ جب بھید کھلے گا تو..... اجمل نے دیکھا کہ سامنے سے چچا گپّی چلے آ رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے بے موقع آ ٹپکتے تھے۔ غیر متوقع بارش کی طرح۔ دراصل ان کو گپ مارنے کا جو مرض ہے وہ گھر پر ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتا بیوی ان کے منہ پہ کہہ دیتی ہیں:

"رہنے دو میرے سامنے بے پر کی نہ اُڑایا کرو۔"

ماں کی دیکھا دیکھی بچّے بھی ان کی باتوں پہ ہنس دیتے ہیں یا مذاق اڑانے لگتے ہیں اسی لیے گپّوں کا پشتارہ لیے وہ تیرا میرا گھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ سب سے بے وقوف پبلک شاید انھیں اسی گھر میں مل گئی تھی کہ جب دیکھو تب آن موجود۔ اجمل نے سوچا جس وقت صُور پھونکا جا رہا ہو گا۔ قیامت کی نفسا نفسی ہو گی اس وقت بھی یہ دوڑے ہوئے آئیں گے اور کہیں گے:

"تمہاری طرف قیامت کی وہ رونق نہیں جو ہماری طرف ہے۔ اجی ہماری طرف تو ہمالیہ کا پورا سلسلہ یوں اڑتا ہوا گزرا ہے جیسے ٹڈی دل اور سنو تو یہاں تو سورج بھی ذرا دُور ہے۔ وہاں تو عین سوا نیزے پر ہے۔ ابھی

ناپ کر آرہا ہوں۔"

غرضیکہ جو چیز ان کی ہو گی وہ بہتر ہو گی۔ جو سماں انہوں نے دیکھا ظاہر ہے کہ کوئی اور نہیں دیکھ سکتا اور جو کچھ ان پر بیتتی ہے وہ تو ہوتی ہی ہے ہمیشہ ناقابلِ یقین۔ مگر جب تک وہ سننے والے کو اس بات کا یقین نہیں دلا دیتے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ کیا گپیں تھیں ان کی۔ شروع میں جب ٹیڈی پیسہ چلا ہے تو انہوں نے دس پندرہ آدمیوں کے مجمع میں فرمایا تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں جب پائی چلتی تھی اس کی یہی شکل اور یہی وزن تھا۔ جن لوگوں کے پاس وہ پائیاں پڑی تھیں۔ وہ اب انہیں ان پیسوں کی جگہ چلا کر لکھ پتی بن گئے ہیں۔ ان کی اس بات پر لحاف میں منہ دے کر وہ گھنٹوں ہنستا رہتا تھا۔ جتنا اس بات پر غور کرتا تھا اتنی ہی ہنسی قابو سے باہر ہوتی جاتی تھی۔ پائیوں کو جمع کرنا..... پھر انہیں پیسوں کی جگہ چلانا..... اور لکھ پتی بن جانا۔ بعد میں اس نے چاہا تھا کہ یہ لطیفہ اپنے دوستوں کو سنائے مگر یہ سوچ کر خاموش ہو گیا تھا کہ کون یقین کریگا بھلا۔ سب اسی کے دماغ کی اختراع سمجھیں گے۔ اور ایک دفعہ ایک بزرگ کے سامنے یہ ایک نامور قاتل کو صفا بچا لینے کی ڈینگ مار رہے تھے۔ اجی صاحب میں نے یہ کیا کہ ایک ریلوے ٹکٹ چیکر سے یاد اللہ تھی اس سے کہا کہ اس کو فلاں تاریخ بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں پکڑ لو۔ بس جناب اس نے اس تاریخ کا میمو کاٹ دیا، پیسے رکھوائے۔ کورٹ میں ثابت ہو گیا کہ قاتل تو اس دن وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ تو ریلی اسٹیشن پر موجود تھا۔ لو صاحب صاف بچ گئے۔ ایسی باتیں سن سن کر جب ان کے کان پک گئے تو ایک دن اس نے ان سے مچٹیا کرنے کی ٹھانی۔ وہ ربڑ کے نل سے گملوں میں پانی دے رہا تھا کہ آ گئے اور بولے:

"یہ کیا پھول ہیں۔ پھول تو صاحب ہمارے آبائی گھر میں تھے ذرا جمل کو معلوم تھا کہ وہ ایک سڑے ہوئے محلے کے خستہ مکان میں رہتے تھے۔ گلاب

کا ایک پودا تھا جس کی ایک شاخ میں سیاہ گلاب کھلتا تھا۔ دوسری شاخ میں زرد اور تیسری میں سُرخ۔ دور دور سے لوگ اس پودے کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اپنا انگریز کمشنر کیا بھلا سا نام تھا اس کا . . . . . "

"اچھا" اجمل نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا:

"مگر آپ نے اس پودے کے کرشمے نہیں دیکھے۔" اس نے ایک سوکھے سے کیکٹس کی طرف اشارہ کیا:

"اس میں ایک دن گلاب کھلتا ہے۔ دوسرے دن لگتی ہیں جامنیں اور تیسرے دن شاخیں گلاب جامنوں سے لدی ہوتی ہیں۔ یقین نہ ہو تو تین دن رہ کر دیکھ لیجئے۔"

اس دن سے گپّی خالو نے اس کا سلام لینا چھوڑ دیا تھا اور اسے اپنے کانوں میں عجیب سا سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے بہت دیر سے بھن بھن کرنے والی مکھی دفعتاً کہیں ہجرت کر گئی ہو۔ اب حتی الامکان وہ ان کے سامنے نہ پڑتا تھا۔ پانی میں چھپا چھپ کرتے وہ اندر آ رہے تھے، جوتے ان کے ہاتھ میں تھے نزدیک دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں سنک گیا اور ان کے اندر چلے جانے کے بعد پھر آن کر کھڑا ہو گیا۔

پہلے سلام کی آوازیں ابھریں۔ پھر ممانی نے کہا:

"کیسے آئے آپ اس وقت؟"

"بس آ گیا، دفتر سے جو نکلا تو سڑک پر سات آٹھ فٹ پانی، کچھ لوگ کشتیوں میں بٹھا کر لوگوں کو گہرے پانی سے نکال رہے تھے۔ میں بھی اسی پہ بیٹھ کر آیا ہوں۔ دو روپیہ کشتی والے کو دیے۔"

کسی نے ان کی بات پر شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ سب کو معلوم تھا کہ جس جگہ

سے یہ آ رہے ہیں وہاں تین فٹ پانی ہے اور سبزی کے ٹھیلے والے اپنے ٹھیلوں پر بٹھا کر نازک مزاج لوگوں کو باہر نکال رہے ہیں۔

"اور بھی کہیں گئے تھے؟" نانی نے پوچھا۔

"ہر جگہ دیکھی ہے۔ بارش سے پناہ لینے والوں کی طرف بھی گیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ سینکڑوں آدمیوں کے مجمع میں کل چار بوریاں آٹے کی آئی تھیں۔ چار اور جناب جب ایک صاحب نے ڈبہ بھر کر آٹا نکالا۔ اور ایک آدمی نے جھولی پھیلائی تو فوٹوگرافر نے جھٹ ویسی تصویر لے لی۔ آٹا انہوں نے واپس بوری میں ڈال دیا اور چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا:

"جاؤ جاؤ بابا اپنا کام کرو۔ تقسیم شام کو ہو گی۔ یہ تو یونہی تصویر کھنچوانے کے لیے تھا۔ اخبار میں جانی تھی، تو یہ حال ہے صاحب۔ یہ ہوتا ہے ہمارے ہاں۔"

"ہاں یہی ہوتا ہے، قومی شعور ہی مر گیا ہے ..... پتا پھینکیے بھائی جان ___ گھٹنے گھٹنے تک کپڑے اٹھا کر پانی میں کھڑے رہنے اور تصویریں کھنچوانے سے لوگوں کی مشکلات تھوڑا ہی حل ہو جائیں گی ..... ارے ارے یہ کیا چل دیا آپ نے۔"

"نہیں بھیا مشکلات تو تاش کھیلنے سے حل ہوں گی۔" جلی ممانی بھی کام کی ایک بات کہہ ہی گئیں جسے سب نے سُنی اَن سُنی کر دیا۔

"میں پوچھتا ہوں جب انہیں معلوم تھا کہ بارش ہونے والی ہے تو انہوں نے پہلے سے کیوں کچھ نہیں کیا۔"

"اپنے عالم صاحب دو دن سے فون کے پاس بیٹھے تھے۔ کہتے تھے گھر سے

باہر نکلنے کا حکم نہیں۔ فون پر بیٹھا ہوں۔ کراچی میں زبردست بارش ہونے والی ہے
ارے صاحب! میں پوچھتا ہوں۔ فون پر بیٹھے رہنے سے کیا بارش رک جائے گی یا
لوگ بچ جائیں گے، انہیں چاہیئے تھا کہ پہلے سے لوگوں کو خطرے سے باہر نکالتے۔
کس کس کو نکالتے، عوام کو بھی تو اطلاع عرصے ہی دی گئی تھی۔ وہ خود کچھ کرتے۔"
ممانی بولیں۔

"وہ کیا کرتے وہ تو یہ سمجھتے رہے کہ ہمیشہ کی طرح اب کے بھی پیشین گوئی
غلط ہی نکلے گی۔ انہیں چاہیئے تھا کہ جتنوں کو نکال سکتے تھے نکالتے یہ کیا کہ مزے
سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔"

"آپ تو خود اس دن سے گھر میں چھپے بیٹھے ہیں، آپ کو کیا معلوم انھوں نے
کیا کچھ کیا۔" اب کے خالہ بھی بولیں۔

"ہمیں معلوم ہے کچھ نہیں کر سکتے یہ ــــ سب کو اپنے حلوے مانڈے سے
کام ہے قومی شعور۔ ۔ ۔ ۔ اوہو یہ کیا کیا آپ نے۔ پان تو یہ کاٹ رہے ہیں۔
چھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساری بازی کا ستیاناس ہو گیا۔"

کاش کہ ایک کنبے، ایک چھوٹے سے کنبے کو آپ ہی نے نکال کر اپنے
خالی پڑے کوارٹر میں جگہ دے دی ہوتی۔ اجمل نے دکھ سے سوچا۔ قومی شعور
حکومت کے کارندوں ہی کو الاٹ ہوتا ہے کیا۔

"ارے تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو ــــ؟" جانے امی کیسے بھولے سے
یہاں نکل آئیں۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"کب آئے کیا حال تھا منوڑہ کا؟ میرا تو ڈر کے مارے برا حال تھا۔"

"سمندر میں لاشیں بہہ بہہ کر آ رہی تھیں۔"

"اے بیٹے، صبح ہی کہہ رہی تھی — نہ جا نہ جا یہ کوئی موسم ہے باہر جانے کا۔"
"کیا اجی ہے — ارے اسے ادھر بھیجو۔ میرے پاس صبح سے دعا مانگتے مانگتے
یہ وقت آ گیا ہے اور یہ آ کر چپ چاپ بیٹھ گیا —" نانی دور سے پکاریں۔ تو وہ
جا کر فرماں برداری سے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"سمندر کا تو آج برا حال ہوگا، کیوں اجی۔" مارے گھبراہٹ کے ان کا اپنا برُا
حال تھا۔

"جی وہ . . . . نہیں سمندر تو خشک پڑا تھا۔" ان کی بوکھلاہٹ دیکھ کر اس
کے منہ سے نکل گیا۔ لڑکیوں میں ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ "ہاں خشک تو پڑا ہی ہوگا۔
سارا پانی تو بادل بن کر اڑ گیا۔"

"اور راستے کا کیا حال تھا — ؟"

"کہیں کمر تک پانی تھا کہیں گھٹنوں تک۔ راستے میں بہت سی بسیں خراب ہوئی
کھڑی تھیں۔ ٹیکسیوں نے میٹر ڈاؤن کر رکھے تھے۔ یک مشت رقم مانگتے تھے۔ دس
پندرہ روپے سے کم کہیں کا کرایہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ ہماری ٹیکسی خراب ہو جائے گی۔
تو کون ذمہ دار ہوگا۔"

"ہاں ہاں وہ تو مانگیں گے ہی ان کی بن آئی ہے۔ پتا پھینکے بھائی جان۔"
"کھانا کھا لیا ؟"
"کھا لیا تھا ایک دوست کے ہاں۔"
"کہاں ؟"
"بہار کالونی میں رہتا ہے وہ . . . ."
"ارے وہاں کہاں چلے گئے تھے۔ یہ موقع ہے ایسی جگہ جانے کا" ابا
نے ڈانٹا۔

واقعی بہار کالونی اور وہاں کا راستہ ...... تو یہ ..... سب جگہ پانی ہی پانی تھا۔ صاف شفاف، نکھرا ستھرا پانی نہیں۔ کالا سیاہ، دنیا بھر کی غلاظت سمیٹ کر چپ چاپ پڑا ہوا پانی۔ اس پری مارکیٹ سے گزرتے ہوئے مچھلیوں کی بُو — کئی جگہ اسے اُبکائی آئی — دوست کے مارے اس نے ناک پہ رومال نہیں رکھا اور دوست نے شاید اس کی شرم سے — مچھلیوں اور گٹر کے کالے پانی کے آگے کوڑوں کے ڈھیر گھروں کے آگے اور گلیوں میں یوں بچھے ہوئے جیسے بڑے آدمیوں کی آمد پر بچھائے ہوئے مخمل و بانات — سامنے ابلتی ہوئی بھوری لیاری ندی اور اس کے پار اندھے روشن دانوں اور ٹوٹی چھتوں والے بھائیں بھائیں کرتے خالی مکان جو کبھی آباد تھے اور آبادی کی ریل پیل سے، بچوں کی لہر بہر سے بند توڑ دینے والی لیاری کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ آج کیسی سونی سونی آنکھوں سے تاک رہے تھے۔ کیسے غمزدہ اور اداس کھڑے تھے۔ اجڑے اجڑے اور سنسان جیسے بے روح کے جسم۔ اس کے دوست کے گھر کے آگے بھی ایک سیاہ سمندر تھا جس کی سطح پہ مچھروں اور بھنگوں کے لاکھوں بجرے تیر رہے تھے۔ پانی میں ڈوبی اینٹوں پہ چھپ چھپ کرتے جب وہ اس کوارٹر نما گھر میں پہنچے اور دوست کھانا لانے اندر گیا تو معلوم ہوا کہ آج گھر میں کچھ بھی نہیں پکا۔ ان کے گھر میں سال اور مہینوں کا راشن نہیں پڑا تھا۔ روز کنواں کھودتے تھے۔ روز پانی نکالتے تھے۔ دو دن سے ابا کنواں کھودنے نہ جا سکے تھے۔ چنانچہ پانی بھی نہ نکلا تھا۔ دوست نے بڑے خفیف ہو کر یہ بات کہی تھی اور اس نے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں آؤ اور کہیں کھا لیتے ہیں۔

اب وہ میزبان تھا اور دوست مہمان۔ اس علاقے میں کسی اچھے ہوٹل کی تلاش بے سُود ہے۔ چنانچہ کوڑے کے ڈھیر کے زیرِ سایہ بنے ہوئے وہ ایک کچی دیواروں والے ہوٹل میں جا بیٹھے جہاں میزوں پہ مکھیاں یوں رینگ رہی تھیں جیسے مر کر بھی یہاں سے نہ

اٹھیں گی۔ پیروں کے نیچے سیاہ کیچڑ تھی۔ اور چھت پر سے ٹپکتا میلا پانی۔ لدھڑ مکھیوں
کا بوجھ اپنے کندھوں اور ہاتھوں پر سہتے ہوئے انھوں نے نان اور کباب کھائے
تھے اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہیضہ دانت نکوسے اس بے دروازے کے ہوٹل
کے آگے ہی کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہاں سے مختلف سواریاں پکڑتا وہ بمشکل
گھر پہنچا تھا۔

"تھوڑا سا تو کھا لو پوریاں پکائی ہیں آج لڑکیوں نے۔"

"اوہو تب تو واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے۔" لڑکیاں پھر کھلکھلا کر ہنس
پڑی تھیں۔

"پوریاں تو ٹھنڈی ہو گئی ہوں گی۔" شہلا نے جو اس پر سب سے زیادہ مرتی تھی
کہا تھا:

"اور بنائے دیتے ہیں۔" زرینہ بولی تھی جو اس پر سب سے زیادہ عرصے
سے فدا تھی۔

لڑکیاں ڈرتی اندر ہی اندر کہ آسمان کی بجلی انھیں نہ دیکھ لے۔ باورچی خانے
میں جا کر پوریاں تلنے لگی تھیں۔ مگر تہمینہ اور باجی رخسانہ وہیں بیٹھی رہی تھیں۔ اجمل کا
تجربہ تھا کہ سگی بہنیں ایسے موقعوں پر کبھی بھی جوش کا مظاہرہ نہیں کرتیں۔ وہ ڈٹ کر
کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ لڑکیاں باری باری گرما گرم پوری لا رہی تھیں اور ایسا کبھی نہیں
ہوا کہ تازہ پوری آنے پر وہ پہلے سے خالی ہاتھ نہ بیٹھا ہو۔ باورچی خانے میں اس
کی بسیار خوری مذاق بنی ہوئی تھی مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔ آخر تہمینہ نے آ کر
الٹی میٹم دے دیا۔

"کمال ہے کتنا کھائیں گے بس کیجئے آٹا ختم ہو گیا۔" لڑکیاں اور آٹا
گوندھنے کو تیار تھیں مگر اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "اچھا تو لو۔ . . . اللہ تیرا

شک ـــ"

تہمینہ کے جانے کے بعد اس نے پوریوں کے پوری تھین کے تھیلے کو بڑے جتن سے اپنی الماری میں چھپایا اور پھر آکر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ بس یہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں اس پر دم دینے والیوں کی آتے ہوئے جان جاتی تھی۔ اور وہ گھر والوں سے محفوظ رہ کر یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ بارش رکنے کا انتظار کرے یا ابھی پوریاں اس تک پہنچا آئے شاید وہ آج بھی اس کے انتظار میں بھوکی ہو۔ جس وقت ہاتھ پکڑ کر اس نے گڑھے میں سے مہتابی کو نکالا تھا اور پھر اس کی پریشان حالی دیکھ کر ٹیکسی میں بٹھا لیا تھا تو اس نے اس وقت سوچا بھی نہیں تھا کہ آخر وہ ان ماں بیٹی کو کہاں لیے جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں گھر لا کر ماں کے حوالے کر دیتا کہ ناظم آباد کے ایک نو تعمیر مکان میں اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جو بارش سے پناہ لینے یہاں آ گئے تھے۔ کچھ سوچ کر اس نے یہیں ٹیکسی رکوا لی ماں بیٹی کو اتارا۔ کوشش کر کے ان کے لیے چارپائی اور بستر مہیا کیا اور پھر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چھپر چھپر کرتا بازار سے انہیں کھانا لا کر دیا اور چلتے وقت یونہی رواداری میں کہہ گیا:

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں پھر آؤں گا۔"

دوسرے دن جب وہ شام کو پہنچا ہے تو وہ کھل کھل ہنس رہی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کل کی بھوکی ہے۔ اس کی ماں نے بتایا:

"بیٹا جب کل راشن بٹنے لگا تو یہ پگلی بولی، اماں ہمارے لیے تو وہ لے ہی آئیں گے۔ پھر دُہری چیزیں لینے کی کیا ضرورت ہے کسی اور کا بھلا ہو نے دو۔ تب سے بیٹے وہ بھی بھوکی ہے۔ اور میں . . . . میں نے تو خیران سے لے کر کچھ کھا لیا ہے۔"

اس نے پڑوس میں پڑے ہوئے کنبے کی طرف اشارہ کیا۔ تب اس نے سوچا اس سے جاکر کہے:

"اے لڑکی پاگل ہوگئی ہے تو — میں نے ہاتھ پکڑ کر تجھے گڑھے سے نکال کیا لیا میں ساری عمر کے لیے تیرے نان نفقے کا ذمہ دار ہو گیا۔ ارے تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اس طوفانی بارش میں تیرے لیے میں شام کو بھی کچھ لے کر آؤں گا۔"

لیکن یہ بھی تو ہوتا ہے کہ جب کبھی آپ پر کوئی ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر بیٹھے تو اس کے اعتماد کو چکنا چور کرنے کے لیے پتھر کا جگر چاہیئے۔ اجمل بھی اس سے کچھ نہ کہہ سکا اور یہ بات اس نے کہی کب تھی۔ وہ تو اسے دیکھ کر کھل کھل ہنسی روک کر دم بخود ہوگئی تھی۔ اس نے بڑھ کر فلمی ہیروئینوں کی طرح یہ نہیں کہا تھا:

"میرے لیے کیا لائے بابو، میں تمہارے انتظار میں کل کی بھوکی ہوں۔"

بلکہ شاید اس خیال کے آنے سے ہی اس کے گلابی گال گہرے ہو گئے تھے۔ پلکوں کی لمبی چادریں پٹاپٹ آنکھوں پر پڑ گئی تھیں۔ وہ ضرور آج بھی بھوکی ہوگی بے وقوف لڑکی۔ اجمل نے چپکے سے اندر جا کر پوریوں کے تھیلے کو ایک میز پوش میں لپیٹا اور چھپ چھپ کرتا پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔

گھر بھر میں شور مچا ہوا تھا ہائے کم بخت یہ دھوبی کپڑے کب لائے گا؟

"اب کیا لائے گا، پہلے ہی رلا رلا کر دیتا تھا۔ اب تو بہانہ مل گیا۔"

"ہائے غضب تو یہ ہوا کہ میری نئی قمیص جو میں نے ڈرائی کلین کے لیے رکھی تھی وہ بھی لے کر چلتا بنا، کم بخت نے اگر دھو دیا تو گئی وہ تو۔"

"ہاں دیکھو تو کیسا چپ چپاتے گٹھر اٹھا کر چلتا بنا، اندر آتا تو میں اسے اپنی

نئی قمیص دکھاتی۔ سارا رنگ کاٹ کے لے آیا۔"

"اور میری ایک شلوار کم تھی امّی۔"

"تو تم نے اسی وقت کیوں نہ کہا۔"

"کپڑے دیکھے کب تھے۔ اس نے گٹھڑ رکھا اور بولا میں ابھی آتا ہوں آپ اتنے کپڑے لکھ کر رکھیں ...... بس پھر باہر سے باہر ہی کپڑے لے کر چلتا بنا۔"

"آنے دو کم بخت کو دیکھو کیسی خبر لیتی ہوں، کیسے کمینوں کے دماغ آسمان پر چڑھے ہیں کراچی میں۔"

یہ بات تو کئی دفعہ اجمل نے بھی محسوس کی تھی کہ جس دن یہ بڑے گٹھڑ کی دھلائی دُھل کے آئی تھی دل بڑا ہلکا ہلکا محسوس ہوتا تھا۔ سفید براق قمیصوں اور پتلونوں سے جیسے آنکھوں میں روشنی آجاتی تھی اور خواہ مخواہ گنگنانے کو جی چاہتا تھا۔ اور جب میلے کپڑوں کا ڈھیر گھر میں پڑا ہو تو دل پہ بوجھ سا رہتا تھا۔ جیسے سو من کا پتھر رکھا ہو۔ آدمی خواہ مخواہ ہی چڑچڑا ہوئے جاتا تھا۔ جیسے آج گھر والے ہوئے جا رہے تھے۔ ہر ایک کو دھوبی کا انتظار تھا سوائے اس کے۔ اسے تو آجکل دھوبی راتوں کو خوابوں میں آکر ڈرایا کرتا تھا۔ "کیوں میاں کب لے گیا تھا میں کپڑے۔" اور وہ خواب ہی میں دھوبی کے آگے ہاتھ باندھ لیتا:

"یار تجھے خدا سمجھے ذرا آہستہ بول۔"

اگر امّی اسے اس کمین کے آگے ہاتھ باندھے دیکھ لیتیں تو کیا کہتیں۔ جس کو دیکھو یہی کہتا تھا:

"کراچی میں ہر شخص کا دماغ آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔"

اجمل تو مدتوں سے کراچی سے باہر نہیں نکلا تھا اس لیے اسے نہیں معلوم تھا کہ دوسری جگہوں کا کیا حال ہے ہاں اسے یہ ضرور محسوس ہوتا تھا جیسے کراچی میں ہر

شخص غیر مطمئن ہو۔ بڑے بڑے امیر کبیر تاجر بھی۔ بڑے بڑے مکان دار بھی، کرایہ دار بھی، مزدور اور رکشا والے بھی اور یہ بے اطمینانی مختلف قسم کی تھی۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے کسی اور کی چیز بھی اگر بہت دنوں اس کے ہاں پڑی رہے تو پھر اس کی جدائی ناگوار ہوتی ہے کوئی لے تو بے انصافی معلوم ہونے لگتی ہے۔ جس کو دیکھو کہتا ہے اب کیا رکھا ہے یہاں۔ وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ وہ پہلی سی تجارت نہ رہی، مکانوں کے ملک بوس کراتے نہ رہے، وہ پگڑیاں نہ رہیں، وہ دھکم پیل نہ رہی اور تو اور اس کے ٹٹ پونجیا نائی نے بھی اعلان کر دیا تھا:

"اس کا کاروبار بڑا مندا ہو گیا ہے۔"

ارے کیوں گناہ سمیٹتے ہو۔ کراچی کا ایک کونا بھی تو خالی نظر نہیں آتا۔ وہی شاپنگ کا عالم، وہی کاروں کی ریل پیل، وہی مکانوں کی گرانی، وہی بھیڑ بھڑکا۔ مگر دل کے یقین کو زبان کہاں تک بدلے گی۔ آخر یہ بے چینی تھی کس بات کی؟ اب اس دن مس فاطمہ جناح کے دفن کے وقت کیا ہنگامہ ہوا تھا، وہ اپنا اسکوٹر سڑک پر سارجنٹ کے اسکوٹر کے نزدیک کھڑا کر کے پٹرول پمپ میں گھس گیا تھا۔ اسی پٹرول پمپ میں جس میں آگ لگا دی گئی تھی۔ شیشے تڑا تڑ ٹوٹ رہے تھے۔ سامنے ایک ڈبل ڈیکر بس اور دونوں اسکوٹر دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ سفید بطخ کا سا خوب صورت اور پسندیدہ اسکوٹر اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ ڈبہ بن گیا تھا۔ بعد میں جب وہ رکشا میں بیٹھ کر دوبارہ اپنے اسکوٹر کی زیارت کرنے آیا ہے تو سڑک پر پانی ہی پانی تھا۔ جس میں جلی ہوئی بس تباہ حال کشتی کا سماں پیش کر رہی تھی۔ دونوں اسکوٹروں کے انجر پنجر کرم خوردہ لاشوں کی طرح عبرت ناک تھے۔ اس نے افسوس سے کہا تھا:

"یہ کوئی موقع تھا ہنگامے کا؟"

اور رکشا والے نے فی البدیہہ کہا تھا:

"بابا..... موقع وقع کوئی نہیں ہوتا جب غصہ آتا ہے تو یوں ہی ہوتا ہے۔"

"کوئی بات بھی ہو غصے کی۔"

"غصے کی کوئی بات نہیں ہوتا...... جب روٹی نہیں ملتی تو غصہ آتا ہے جب تمہیں اپنے افسر پر غصہ آتا ہے تو تم کس پر اتارتا ہے اپنے ماتحتوں پہ، ہم کو جب اپنے مالک پہ غصہ آتا ہے تو ہم گھر جا کر اپنے بچوں کو مارتا ہے، بیوی کو مارتا ہے، گھر کی چیزیں توڑتا ہے، غصہ ایسی چیز ہے بابا...... تمہیں نہیں پتہ ہے زندگی کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارا دل کرتا ہے ابھی کہیں لیٹ جائے اور مر جائے بس۔"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں بھائیں بھائیں کرتے سناٹے گونج رہے تھے اور اس کے بعد اس نے ایسی بے جگری سے رکشا چلائی تھی کہ موت اور زندگی کے فاصلے کئی دفعہ مٹتے مٹتے بچے تھے۔ یہ بے اطمینانی اس نے سارے ٹیکسی چلانے والوں اور منوّرہ کے مزدوروں میں بھی محسوس کی تھی اور اُن لوگوں میں بھی جو دوسرے ملکوں سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آئے تھے اور دن رات وہیں کے خواب دیکھتے تھے۔ جانے یہ لوگ کیا چاہتے تھے مگر اس نے تو شکایت کا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا جس کے پاس تن کے پھٹے جوڑے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دوسری لڑکیاں اس گٹھڑی پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ اسے ڈر ہوا ایسا نہ ہو سب چیزوں کے حصّے بخرے ہو جائیں اور وہ جس کے لیے سارا کھڑاگ کیا ہے خالی ہاتھ رہ جائے اس لیے اس نے اچھا سا جوڑا جلدی سے الگ کر لیا تھا۔ تہمینہ کی قمیص جس کے سارے گریبان پر نیچے تک سرخ لیس لگی ہوئی تھی اور سفید ربن پرویا گیا تھا۔ وہ اس نے محبوبہ کا گٹھ باندھ کر غلطی سے اوپر رکھ دی تھی اور شاید رخسانہ کی لٹھے کی نئی شلوار تھی اور امّی کا ململ کا دوپٹہ تھا۔ یوں اس نے گٹھڑ کا بہترین جوڑا اس کی نذر کرنے کے بعد باقی کپڑے وہاں کوڑے کھڑے سب کو بانٹ دیے تھے۔ اس میں سلمان بھیا کے

آدم جی لال کے کٹاؤ دار کرتے بھی تھے جو انہوں نے اس سال بڑے چاؤ سے بنوائے تھے۔ زاہد و پرہیزگار ممانی کا نیا غرارہ بھی تھا۔ ابّا کے رومال بھی تھے، پلنگ کی سفید چادریں بھی تھیں، لڑکیوں کی ڈھیروں شلواریں بھی تھیں، اس کے اپنے کپڑے، خیر بہت کچھ تھا۔ اب اس کا جھگڑا کیا ہے۔ بات تو یہ تھی کہ اسے صرف ایک جوڑا ململ کا وہ قمیص دیکھ کر کتنی ہی لڑکیوں کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ تہمینہ بیچاری نے بھی تو شاید دو چار دفعہ ہی پہنی تھی۔

اور پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن دھوبی آن پہنچا اور مزے سے نانی کے تخت سے کمر ٹکا، پیر پھیلاتے ہوئے بولا:

"لاؤ کپڑے دے دو۔"

"ارے اب کی دھلائی کہاں ہے؟"

"کیسی دھلائی، دے نہیں گیا تھا پچھلے منگل کو۔"

"ارے پچھلے منگل کی بات ہو رہی ہے یا اس منگل کی، اب کے کپڑے کہاں ہیں"

"لو جی لو اور سنو...... میں لے کہاں گیا تھا۔ تم سے کہہ کر گیا تھا۔ ابھی آ رہا ہوں۔ پھر جو اُدھر تک پہنچا ایسی بارش کہ میں تو ادھر ہی سے گھر کو لپک گیا اپنے۔"

"ارے گھاس کھا گیا ہے۔ وہ گٹھر اٹھا کر نہیں لے گیا تھا، ادھر زینے میں رکھا تھا۔" سلمان کو اپنے کٹاؤ دار کرتوں کا بے چینی سے انتظار تھا۔

"قسم لے لو، ایمان سے میں تو ادھر آیا بھی نہیں لوٹ کے، آج آیا ہوں۔"

سب نے اپنے سر پیٹ لیے اور باری باری ایک ایک کپڑے کا ماتم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ نانی نے پرانے غرارے سے بنائے گئے اپنے نئے کمر بندوں کا ذکر بھی نہ چھوڑا۔ اجمل کے خیال میں یہ ماتم قطعی بے موقع تھا۔ کپڑوں کا سوٹم تو گزر رہی

پکا تھا اور دسویں میں ابھی کئی دن باقی تھے۔

"ارے تو پھر گٹھر کون لے گیا؟"

"لے گیا ہوگا کوئی چور، اٹھائی گیرا۔"

"ارے وہی کم بخت عورت لے گئی ہوگی۔ یاد نہیں اس دن آئی تھی۔ کہہ رہی تھی بارش میں گھر کی چھت اڑ گئی ہے کچھ پیسے دے دو۔ میں نے اسی دن نہیں کہا تھا کہ اب تو سب کو مانگنے کا بہانہ مل گیا۔ صفا چوٹی لگ رہی تھی صورت سے۔

"ہاں ہاں ضرور وہی لے گئی یا تو چونّی لے کر بھی نہیں سرک رہی تھی یا ذرا دیر میں ایسی گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔"

"ارے ان کم بختوں کو نہ پیسہ چاہیئے نہ دھیلا۔ یہ تو مُردوں کو تاکنے آتی ہیں مُردوں کو" ممانی اپنے میاں کی طرف سے خاصی بدزن تھیں۔

"ہائے میری نئی قمیص!"

"ہائے میری نئی شلوار!"

"اور میرے نئے کرتے کناوُدار کام کے۔"

صرف ایک وہ تھا جو خاموشی سے کاغذ پر قلم گھستا رہا۔ اس نے گھر کے ہائے واویلا میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ تب بھی کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوا۔ اس کی عادت ہی ایسی تھی۔ اب یہی دیکھ لو بارش میں جب سارے گھر کا برا حال تھا۔ وہی تھا جو جلے پاؤں کی بلّی بنا اندر باہر گھومتا رہتا تھا۔ بچپن میں چار سال ہاسٹل میں کیا گزار دیے تھے کہ وہ گھر بھر سے نرالا نکل گیا تھا اور اب پھر رہا تھا مرچنٹ نیوی میں انجینئر بننے کو کہ سال میں کئی کئی مہینے سمندروں کے تھپیڑے کھاتا پھرے۔ کیسا ایک ایک نے اسے سمجھایا اور ڈرایا تھا مگر اس کی تو ہر بات ہی نرالی تھی ایسے میں اس بات کا کیا وہم ہوتا کہ وہ اپنی سفید قمیصوں اور پتلونوں کو نہیں رو رہا۔

اِدھر اُدھر سے سمیٹ سماٹ کر دھوبی کو کپڑے دیے گئے۔ ممانی پان لگاتے ہوئے بولیں:

"اے جی دھوبی! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں یہ منگل کے دن کپڑے لانے اور لے جانے کا چکر چھوڑو۔ لو جی بیٹھے بٹھائے چالیس پچاس کپڑوں کی چپت پڑی گئی"

"پھر کس دن لایا کروں جی؟"

"جمعے کے جمعے۔"

"نہ، جمعے کو اپنے ہجار کام ہووے ہیں۔"

"تو اور کسی دن سہی۔"

"اچھا جمعرات کو لایا کروں گا آئندہ سے، سلام علیکم۔"

دھوبی اپنا گٹھر باندھ کر چلا گیا اور گھر میں کپڑوں کا ماتم ہوتا رہا۔ اجمل نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور باہر چلنے پر کمر باندھی۔ اسی وقت ریڈیو نے پھر بارش کا اعلان کر دیا۔ کپڑوں کو بھول کر سب جان کی فکروں میں لگ گئے۔

اسکول کالج کھلنے کا اعلان کر دیا گیا۔ آسمان ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ سڑکوں پہ بدستور پانی تھا۔ لڑکیوں نے پہلے کوٹھے پر چڑھ کر آسمان کے بادلوں سے صلاح مشورہ کیا۔ پھر بہزار دقت گھر سے نکلیں۔ تہمینہ سب میں ڈرپوک تھی اور سلمان بھیّا کی لاڈلی بھی، وہ اسے کالج چھوڑنے اور لانے پر تیار ہو گئے۔ شام کو جب وہ واپس آئی تو اس پر عجیب ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ وہ سلمان بھیا سے کہہ رہی تھی:

"بھیا آپ نے منع کر دیا ورنہ میں تو سچ مچ اتنوا کر دم لیتی۔"

"چلو جانے دو اب وہ تمہارے کس کام کی تھی۔"

"قصہ کیا ہے؟"

"ارے کمال ہُوا۔ ابھی راستے میں وہ جو نئے مکان بن رہے ہیں نا اس کے پاس ایک لڑکی میری لیس والی قمیص پہنے کھڑی تھی۔"

"تمہیں کیا معلوم کہ وہ تمہاری ہی تھی۔"

"لو میں اپنی قمیص نہیں پہچانتی۔ اپنی سلائی، سرخ لیس، سفید ربن، وہی گلا اور جناب پیچھے جا کر میں نے اپنی زپ تک پہچان لی۔"

"اچھا پھر کیا ہُوا؟"

"پھر کیا ہونا میں نے اس کے گال پہ ایک تھپڑ جڑا اور پوچھا۔ چڑیل یہ قمیص تُو نے کہاں سے لی؟"

اجمل کا دل دفعتاً ڈوبا..... اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے گال تک گیا اور وہ زخمی چڑیا کی طرح منہ کھولے تہمینہ کی بات سننے لگا۔

"لڑکی تو کچھ نہیں بولی وہاں سب کائیں کائیں کرنے لگے کہ یہ قمیص تو اسے امدادی کپڑوں میں ملی ہے، میں نے کہا ہرگز نہیں۔ میری یہ قمیص چوری ہوئی ہے اور میں اسے اتروا کر دم لوں گی۔ وہ لڑکی تو اتارنے کو تیار تھی مگر بھیا کہنے لگے۔ رہنے دو میں تمہیں دوسری بنوا دوں گا۔"

اجمل کا دل چاہا اٹھ کر سلمان کے ہاتھ چوم لے ـــــ بھیا تم سچ مچ عظیم ہو میں نے تو آج تک تمہیں پہچانا ہی نہیں تھا۔

"اور امی مجھے شک ہے کہ آپ کی ہری قمیص وہاں ایک بڑھیا پہنے بیٹھی تھی مگر میں نے غور سے نہیں دیکھا اسے۔"

یا خدا..... جو وہاں کوئی کہہ دیتا کہ یہ گٹھڑ تو ایک صاحبزادے باندھ کر لائے تھے جو کپڑے اپنے دستِ خاص سے بانٹ کر گئے تھے تو..... مگر تہمینہ کی بچی، کیا سچ مچ تُو نے اس کے گال پہ تھپڑ مارا..... سمجھ میں نہیں آتا کہ

اس پاداش میں تیرے ہاتھ توڑ دوں یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انہیں چوم لوں کہ انھوں نے ۔ ۔ ۔ ۔
اُن گالوں کو چھُوا ہے۔

"بھیا پھر مجھے ویسی ہی قمیص بنوا دیں گے نا ؟"

"ہاں ہاں —" سلمان نے اپنا بڑا سا بٹوا نکالا اور دس کا ایک نوٹ نکال کر تہمینہ کی طرف پھینکا۔ آج تک اجمل نے سلمان کو ایسی فراخ دلی کرتے نہیں دیکھا تھا وعدے تو بہت ہوتے تھے مگر یوں فوراً کے فوراً ان کو نباہ دینا آج ہی کا کرشمہ تھا سچ ہے بارش نے ہر ایک کا دل گداز کر دیا ہے۔ مبارک ہے یہ بارش ایسے لوگوں کیلئے

دس رُپے کے نوٹ نے دفعتاً تہمینہ کے دل کو گداز کر دیا۔ وہ بولی "ارے زرّیں وہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی اتنی کہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"

"کون لڑکی ؟"

"ارے بھئی وہی جس کا ذکر ہو رہا ہے، جس نے میری قمیص پہن رکھی تھی کتنی پیاری تھی ہے نا بھائی جان ؟"

"ہونہہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے غور نہیں کیا۔"

"لو یہ بھی کوئی غور کرنے کی بات ہے۔ میں کیا اتنی دیر اس کی صورت پہ غور کرتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب میں نے اس کے تھپڑ جڑا اور اس نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا تو پتہ ہے میرا دل چاہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے زرینہ کے کان میں کچھ کہا اور دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"سچ اگر وہ اتنی خوب صورت نہ ہوتی تو پتہ نہیں میں اسے کتنا مارتی قمیص لاتی بھی نا تو وہیں جھیر جھیر کر دیتی مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کون خوبصورت ۔ کس کا ذکر ہو رہا ہے —" ابا سمجھے شاید شادی کے لیے کوئی نئی آسامی زیر غور ہے۔

"ابا تھی ایک لڑکی اس کا ذکر کر رہے ہیں۔"

"ہوگی کوئی کالی کلوٹی تم لوگوں کو تو کالی لڑکیاں ہی خوبصورت نظر آتی ہیں۔"

"نہیں ابا وہ تو ایسی گوری ہے جیسے چاند۔"

"تو پھر دیر کاہے کی ہے۔" لڑکیاں حسب عادت ایک ساتھ کھلکھلائیں۔

"لو اب اس کو بھابھی بناؤ جس کو ایک چانٹا جڑ آئی ہو۔"

"ہے کون بھئی وہ؟"

"ابا وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو بارش سے پناہ لینے کے لیے نئے مکانوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بیچاری کی جھگی بہہ گئی ہے۔"

"ارے ـــ" ابا فوراً ہی وہاں سے سٹک گئے۔

"ہاں بھئی رنگ روپ تو آجکل جھگی والیوں میں رہ گیا ہے۔" ممانی نے کہا

"بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی طرح پڑھ پڑھ کر وہ خود کو جلاتے نہیں ڈولتیں نہ دھوپوں میں پھرتی ہیں۔"

"یوں کہو ان ہڑ دنگیوں کی طرح کھلے منہ نہیں پھرتیں۔ برقع بھی تو اب جھگیوں ہی میں رہ گیا ہے۔"

"ہاں سچ تو ہے دھوپ نہیں لگتی برقع میں۔"

"دھوپ کی بات نہیں دلہن۔ غیر مردوں کی نگاہیں نہیں پڑتیں۔ جن کنواریوں کے چہرے پہ غیر مردوں کی نگاہیں پڑیں گی ان کی صورت پہ پھٹکار تو آپ ہی برسے گی۔ ارے سارا رنگ روپ تو ان کی نظریں لے اڑے ہیں۔ اسی لیے تو ہمارے زمانے میں لڑکیوں کو غیر عورتوں سے بھی بچاتیں تھے۔ ہمارے ہاں جہاں کوئی غیر عورت گھر میں گھسی اماں نے آنکھ سے اشارہ کیا اور ہم لڑکیاں اٹھ کر اندر۔ . . . ارے تب ہی تو یہ حال تھا۔ اب کیا کہوں لڑکیوں کے سامنے۔"

نانی پنکھیا منہ کے آگے کر کے باقاعدہ شرمائیں:

"تمہارے نانا اللہ بخشے پیروں کو نظر لگائیں تھے پیروں کو، منہ کا ذکر نہیں اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہمارے پیروں پہ آجکل کی لڑکیوں کے چہروں سے زیادہ روپ تھا۔

...... سچ آجکل کی لڑکیوں کو دیکھوں تو دل پر مکہ سا پڑے ہے، اڑومنگی ہوائی دیدہ۔

...... جو کوئی مجھ سے پوچھے تو میری نظر میں یہ سارے گھرانے جن کو تم شریف کہو ہو رنڈی خانے ہیں۔ رنڈی خانے" نانی جب بولنے پہ آتی تھیں تو بولے ہی چلی جاتی تھیں لانگ پلیئنگ ریکارڈ کی طرح اور ایسے وقت ہوتا کیا تھا کہ لڑکیاں سب فوراً نزی بری ہو جاتی تھیں، مگر جب، نانی کو ایک دفعہ اپنا ماضی یاد آجاتا تھا تو اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ جو کوئی پاس کھڑا ہوتا بس اسی کی شامت آجاتی اس وقت اتفاق سے اجمل نزدیک کھڑا تھا۔

"اے بیٹے کلجگ ہے کلجگ ...... یہ کپڑے دیکھو یہ ٹھسّہ دیکھو۔ بن سنور کر مردوں کو سنگھار دکھاتی پھریں ہیں ...... میں نے بھیّا شادی کے بعد پہلی مرتبہ آئینے میں منہ دیکھا۔ ورنہ ہم جانے ہی نہیں تھے کہ آئینہ کس چڑیا کا نام ہے یہ نہیں کہ گھر میں آئینہ نہیں تھا۔ ہاں ایسے آئینے بھی نہیں تھے کہ موئے ایک ایک میز میں تین تین یہ بڑے بڑے جڑے ہیں اور کنواری لڑکیاں ہیں کہ ساڑی باندھتے ہوئے مارلنک کے آگے پیچھے دیکھ رہی ہیں ...... چھوٹا سا فریم میں جڑا ہوا آئینہ طاق میں رکھا تھا مگر کبھی اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی کہ اماں نے دیکھ لیا تو ......

گھر سے باہر جانے کا تو خیر سوال ہی کیا تھا۔ سات سال کی تھی جب سے باقاعدہ پردا شروع ہوا تھا"

اجمل نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔ واقعی سات سال کی عمر میں باقاعدہ پردے کی بات آج کتنی مضحکہ خیز تھی

"اور شادیوں کے بھی یہ طریقے نہیں تھے جیسے تمہارے اور تمہارے بھائی کے لیے گھر گھر پھر کر لڑکیاں تلاش ہو رہی ہیں۔ نائینیں بات ڈالتی تھیں پھر گھر والے آ تے لڑکیاں دکھانے دکھانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بس زبان سے کہا بات پکّی ہو گئی۔ سات سات سال تک نہ آنا نہ جانا، نہ لینا نہ دینا۔ مگر کیا مجال جو کسی کے دل میں شک بھی ہو کہ یہ شادی نہیں ہو گی آ جکل کی طرح نہیں کہ پٹا پٹ منگنی اور نکاح ٹوٹ رہے ہیں ..... اور بھئی نہ یہ دکھاوے تھے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھروں میں سادہ شادیاں ہوتی تھیں۔ میری شادی میں خدا تمہارا بھلا کرے۔ نو جوڑے، چوبیس چھوٹے بڑے تانبے کے برتن، ایک پلنگ اور ایک بستر ہاں البتہ زیور زیادہ تھا، ایک گلے کا ہار اور ......"

اجمل نانی کی یاد داشت کو تو ضرور سراہ رہا تھا اس کے علاوہ اور ساری چیزیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ جہیز کی فہرستیں اسے ہمیشہ لمبی لگتی تھیں۔ زیوروں کا نام سنتے ہی اس نے گھبرا کر پہلو بدلا اور کہا :

"ابھی آیا نانی اماں"

پھر وہ کہاں اور نانی کہاں۔ باقی ماندہ داستان بیچاری پنکھیا کو سننی پڑی۔

تو تہمینہ آج تو نے اس کے گال پر تھپڑ مارا ..... اس بات کے لیے تیرا یہ بھیّا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اجمل نے تکیے پر لیٹ کر چھت کو تکتے ہوئے سوچا ..... ایک قہقہہ نزدیک سے ابھرا۔ اجمل نے پلٹ کر دیکھا۔ سلمان کھڑا ہنس رہا تھا۔

"ان عورتوں کے فلسفے پڑھنے نہیں اس لیے گوری ہیں ..... اب اسی لڑکی نے جس کا ذکر ہو رہا تھا اس سال نویں کا امتحان دیا ہے ... تعجب ہے آجکل کیسے کیسے غریب لوگ اپنے بچّوں کو پڑھا رہے ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم کہ اس نے نویں کا امتحان دیا ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا اس سے، تہمینہ بیگم تو عورتوں سے لڑتی رہیں اور میں اس سے باتیں کرتا رہا...... یار ایک نمبر چیز ہے۔"

"مگر...... مگر آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ نے غور سے نہیں دیکھا اسے۔"

"ارے یار گھر کی لڑکیوں کے سامنے یونہی باتیں کرنی چاہئیں، خصوصاً جب بزرگ بھی موجود ہوں...... یاد رکھو یہ گر نمبر پندرہ ہے جتنے گر میں بتا رہا ہوں سب یاد کرتے جا رہے ہو نا، کام آئیں گے۔" سلمان نے حسبِ عادت سیٹی بجائی قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنی ٹانگیں فاختہ کے پروں کی طرح پھڑپھڑائیں، دو تین چٹکیاں بجائیں اور غسل خانے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اسکول کالج برائے نام کھل کر پھر بند ہو گئے تھے۔ سڑکوں پہ بدستور پانی تھا۔ اسکولوں میں پناہ گزین موجود تھے اور بارش بدستور ہو رہی تھی، کبھی کبھی صرف سانس لینے کو رک جاتی تھی۔ بارش نہیں ہو رہی تھی مگر سیاہ بادلوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ چلے آ رہے تھے جیسے نمازی عید کی نماز پڑھنے عید گاہ کی طرف بھاگے جا رہے ہوں۔ آج کئی دن بعد پتنگوں کی بہار لوٹ کر آئی تھی۔ گھٹاؤں کے پسِ منظر میں رنگ برنگی پتنگیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ سرخ، اودی، نیلی پیلی اور جو دورنگی تھیں وہ لہریا چندری کی طرح اور بھی بہار دے رہی تھیں، پیچ پڑ رہے تھے۔ پتنگیں کٹ کر ہوا کے دوش پہ تیرتی چلی جا رہی تھیں۔ لڑکے بالے ان کو لپکنے کے لیے بھاگ رہے تھے، کچھ بانس لیے کوٹھے پہ سے ان کے گزرنے کے منتظر تھے، کبھی زمین پہ بھاگنے والوں میں سے کسی کے ہاتھ لگ جاتی، کبھی کوٹھے پہ سے کوئی لپک لیتا۔ کوئی پتنگ بازی کے انٹرنیشنل قانون کی خلاف ورزی کرتا تو فوراً دہائی پڑ جاتی

پتنگ کٹی نہیں ہے ٹوٹی ہے واپس کرو اور لوٹنے والے کو واپس کرنی پڑتی۔ اتنے دن کی بارش کے بعد اس گہما گہمی میں اجمل بھی خود کو بڑا چونچال سا محسوس کر رہا تھا۔ چھت پر چڑھ کر وہ چھوٹے بچّوں کے ساتھ پتنگ اڑانے لگا۔ تہمینہ اور باجی رخسانہ بھی آ گئیں، پھر سجیلہ اور رجیہ آ گئیں اور پھر تو سب آتے ہی چلے گئے۔ کوٹھا بھر گیا منّے بچّے دو منزلہ عمارت کے لیے لائی گئی گیلی بجری سے گھروندے بنانے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ لڑکیاں پتنگوں سے پیچ پڑتے اور کٹتے دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتی رہیں شور شرابا سن کر پاس پڑوس کے رشتہ دار بھی آ گئے۔ یہاں تک کہ شمسہ آپا بھی آ گئیں۔ آج اس نے شمسہ آپا کی موجودگی کو بھی اتنا محسوس نہیں کیا۔ ہوا کے دوش پر ان رنگ برنگی تتلی جیسی پتنگوں کو اڑتا دیکھ کر یکایک اس کا دل بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ اس وقت کیا کر رہی ہو گی؟

امّی چھجے پر جھک نیچے دیکھ رہی تھیں۔ پتنگ کی ڈور کسی بچّے کو تھما کر وہ ان کے پاس چلا گیا۔

"امّی ہمارا ایک سرونٹ کوارٹر خالی پڑا ہے نا؟"

"ہاں، کیوں؟"

"وہ ..... وہ بیچاری ایک بڑی بی ہیں ..... ان کا گھر بارش میں ....."

"ایک بڑی بی کیا .... ہزاروں کے گھر گر گئے ہوں گے۔"

"ہاں مگر ..... ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں۔"

"کوئی کام وام کر سکتی ہیں گھر کا؟"

"ہاں کیوں نہیں، کر ہی دیں گی کچھ نہ کچھ، کپڑے بہت اچھے سیتی ہیں۔ آجکل بھی جب سب خالی بیٹھے ہیں۔ وہ ہی آس پاس کے گھروں سے کپڑے لا کر سی رہی ہیں۔"

"اچھا اور تو کوئی نہیں ساتھ۔"

"وہ..... وہ ایک لڑکی ہے چودہ پندرہ سال کی ....."

"نہ بھیا توبہ میری، میں جوان چھوکریوں کو گھر میں نہیں رکھتی، اپنے ہی گھر کی ماشا اللہ نہیں سنبھلتیں..... ہاں سچ یاد آیا میرے کمرے کا ایک بلب فیوز ہو گیا ہے، وہ ذرا بدل دینا۔"

"بہت اچھا۔" اس نے سر جھکا کر کہا اور جھٹ پٹ سیڑھیاں اتر گیا۔ ابھی ابھی اس کے دل میں جو لطافت سی پیدا ہوئی تھی اور وہ رنگین پتنگ کی طرح اوپر ہی اوپر اڑنا شروع ہوا تھا وہ ہم سے بیٹھ گیا۔ جیسے تیز ہوا سے نازک پتنگ کے پرخچے اڑ گئے ہوں اور وہ یکبارگی نیچے آن گری ہو۔

"ارے کہاں چلے گئے سب؟" نانی نے جہاں گھر کی چہل پہل میں کمی دیکھی اور گھبرا اٹھیں۔

"اوپر چلے گئے ہیں نانی اماں —" نانی کو تلے دانی ٹٹولتے دیکھ کر وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"نانی اماں..... وہ..... جو لوگ بارش سے بے گھر ہو گئے ہیں نا..... ان کی مدد کے لیے کچھ دے دیجئے۔"

"ارے واہ! اپنی اماں سے لو میرے پاس کیا رکھا ہے۔" نانی نے بغیر سرمے دانی نکالے جلدی جلدی تلے دانی لپیٹ دی۔ بلا سے اس وقت سرمہ نہ لگائیں گی مگر ایسا نہ ہو یہ اُچکا ان کی تلے دانی میں سے کچھ اُچک لے جائے۔ ہاں نہیں تو، او وقت بے وقت کے لیے رکھے ہیں۔ ان کی کون سی کمائی آ رہی ہے۔

اپنا سا منہ لے کر کمرے میں آیا تو سلمان بھیا پورے صاحب بہادر بنے کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مار جوتے رگڑے جا رہے تھے۔ اجمل کو ہنسی آئی ایسا تو باہر کیچڑ اور پانی ہے۔ بڑی سے بڑی اور اچھی سے اچھی سڑک میں لبالب پڑے ہوئے ہیں۔ بندر روڈ اور میکلوڈ روڈ پانی میں ڈوبی کھڑی ہیں۔ الفی کی فلیشن ایبل

دو کانوں تک میں پانی چلا گیا ہے، گیلی سڑکیں ٹریفک کی یلغار سے اُدھڑی پڑی ہیں اور آپ ہیں کہ جوتے چمکا رہے ہیں، جیسے ان کے لیے سڑکوں پر بانات بچھے ہوں۔

"کہاں جا رہے ہیں بھیا؟"

"یار کئی دن سے نکلا نہیں، ذرا کمر سیدھی کرنے جا رہا ہوں۔"

"واقعی کئی دن سے لیٹے لیٹے آپ کی کمر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ کار میں بیٹھ کر سیدھی ہو جائے گی۔" اس نے کہا۔ سلمان کئی دن سے چھٹی پر تھا۔ قصرِ امین سے کام پر صرف وہی لوگ جا رہے تھے جنہیں دفتر سے لمبی اور اونچی گاڑیاں لینے آتی تھیں۔ سلمان نے جھک کر سوٹ کیس میں سے اپنا بٹوہ نکالا جو کسی پیٹ والی کی طرح پھُولا ہُوا تھا۔

"بھیا!"

"ہوں ہہ!"

"وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم کچھ لڑکے بارش زدہ لوگوں کے لیے پیسے جمع کر رہے ہیں اگر آپ بھی کچھ دے دیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"ارے یار چھوڑو، ان چکروں میں کیا رکھا ہے۔ کرنے والے بہت کر رہے ہیں۔ تم کیا کرو گے۔" بٹوہ جیب میں پہنچ گیا۔

"کچھ کپڑے ہی اگر فالتو ہوں۔"

"کپڑے!" اونچا تیز خبیث سا قہقہہ بلند ہُوا۔ "یار زکوٰۃ تو پہلے ہی نکل گئی۔" اجمل کو محسوس ہُوا جیسے اس قہقہے میں قہقہے کے ساتھ کچھ اور بھی ہے، کیا اس کے راز کی پردہ داری؟

"ہاں یاد آیا کچھ بیکار پڑے ہیں۔"

سلمان نے الماری میں سے چند بے حد سڑانڈے موزے نکال کر اجمل کی طرف اچھال دیے اور سیٹی بجاتا اپنے چہیتے راستے یعنی غسل خانے کی طرف سے باہر نکل گیا

اجمل کو معلوم تھا کہ وہ جب بھی کسی شریف کام پہ روانہ ہوتا۔ صدر دروازے سے جاتا مگر بچپن دوستوں کے گھر یا دوسری مہموں کے لیے یہ راہ چنی جاتی۔ موزوں کی سڑاند سے گھبرا کر اجمل باہر جا کر صحن میں بیٹھ گیا۔ اوپر سے لڑکیوں کے بے تحاشا ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ خود پتنگ اڑانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آج پہلی دفعہ اس نے محسوس کیا۔ کہ لوگ کتنے مختلف انداز اور آوازوں میں ہنستے ہیں۔ شمسہ آپا کی ہنسی کس قدر مشترک ہے وہ دانت بھینچ کر اور سر کو پیچھے پھینک پھینک کر یوں ہنستی ہیں جیسے رو رہی ہوں اور بہت دیر تک روتے رہنے کا ارادہ ہو اور پھر ہنستی بھی کس قدر ہیں اور کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کہ سننے والے کو یا تو ہنسی آنے لگتی ہے یا رونا۔ ان کی اس ہنسی کے پیچھے سنتے ہیں اک کرب بھری زندگی ہے۔

یہ اس کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ تھا کہ شمسہ آپا کسی پہ عاشق ہوئیں اور وہ حضرت کسی اور سے شادی رچا بیٹھے۔ بس انہوں نے شادی سے انکار کر دیا اور ایک عمر کا کنوارپنا بیوگی کے عالم میں کاٹ دیا۔ شمسہ آپا کا گھرانہ وہ گھرانہ ہے۔ جو خاندان کے ہر شخص پہ معترض ہوتا ہے مگر کسی کی مجال نہیں کہ خود ان کی کسی بات پر انگلی اٹھا سکے۔ ماں باپ، بہن بھائی سب ایسے پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑتے ہیں کہ وہ اپنے مرنے کی دعائیں کرنے لگتا ہے پہلے بھی ان کے بارے میں چند افواہیں اڑی تھیں مگر چند سال ادھر تو انہوں نے خوب پر پرزے نکال لیے تھے۔ بازار میں کبھی کسی کے ساتھ، کبھی کسی کے ساتھ نظر آنے لگی تھیں۔ پھر کاریں انہیں گھر سے لینے آنے لگیں۔ اور اب تو یہ بات بھی پرانی ہو گئی تھی۔ اتنی عام کہ ان کے ہاں جانے والا ہر شخص یہ جانتا تھا۔ کہ سب ان کے "کزن" ہیں۔ باہر والوں کو چھوڑ کر اب خاندان والوں سے بھی ان کا تعارف یہی کہہ کر کرایا جانے لگا تھا اور مزا تو اس وقت آتا تھا جب دو "کزنوں" کا آپس میں تعارف یوں ہوتا تھا:

"آپ سے ملئے آپ ہمارے کزن ہیں۔۔۔۔ اور آپ۔۔۔۔ آپ بھی ہمارے کزن ہوتے ہیں۔"

یہ وہ بولڈ خاتون ہیں کہ جب پہلے پہل خاندان کی کسی بہادر خاتون نے جان پر کھیل کر ان پر آوارگی کا الزام لگایا اور ماں باپ نے ان سے پوچھ گچھ کی تو رو رو کر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور کہا کہ اگر ان پر ایسی تہمتیں دھری گئیں تو وہ زہر کھا لیں گی۔ مگر ابھی نہیں۔۔۔۔۔ نو مہینے بعد تاکہ سب کو یقین ہو جائے کہ وہ ایسی ویسی نہیں تھیں۔ اوہ دنیا میں کیسے کیسے ناقابلِ یقین کردار ہیں! مگر اب یہ کہانی بھی پرانی ہو چکی تھی۔ آج کل ان کی باتوں میں زہر وہر کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔ بھیڑیئے کے بھٹ میں ہاتھ ڈال کر اگر کوئی اعتراض کر ہی بیٹھتا تو وہ بڑے اعتماد سے کہتیں:

"میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

اب کون ان سے پوچھتا کہ جو کسی چیز کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں وہ چوروں کو ساتھ لے کر گھومتے ہیں کیا؟ یا چور ہی چیز کی اچھی حفاظت کر سکتا ہے۔ ان کے والد کی پنشن ہو چکی تھی، بیٹے برسرِ روزگار تھے مگر مشکل سے اپنے اپنے گھر کی گاڑی کھینچ رہے تھے ایسے میں یہ بیٹی ہی ماں باپ کے سر کا سایہ اور کفیل تھیں اور ماں باپ ان کی حرکتوں کو نہایت خندہ پیشانی اور بردباری سے برداشت کر رہے تھے کیونکہ ایک مرتبہ وہ ملک چھوڑ کر چلے جانے کا ڈراوا بھی دے چکی تھیں۔ احتیاج — بڑوں کو چھوٹا اور چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے اور اسی لحاظ سے فرماں برداری کے معنی بھی بدل جاتے ہیں اب شمسہ آپا تو ماں باپ کو فلاں کام کرنے یا نہ کرنے پر ٹوک سکتی تھیں مگر وہ اس بات کے مجاز نہیں تھے۔۔۔۔۔ اُف دنیا میں اس بائیس سال کی چھوٹی سی عمر میں۔ جسے نانی کچی عمر کہا کرتی تھیں اس نے کیا کچھ نہ دیکھ ڈالا تھا۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ شمسہ آپا دفعتاً اس پر بھی بیحد مہربان ہو گئی تھیں۔ انہیں تصویریں کھنچوانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر اسے

ساتھ لے جاتیں۔ اسٹوڈیو میں کبھی کبھی اسے اپنے ساتھ کھڑے ہونے یا بیٹھنے کا شرف بھی بخشتیں۔ زیادہ موڈ میں ہوتیں تو کمر میں ہاتھ بھی ڈال لیتیں اور پھر ایسی تصویریں اسی ہسٹیرک ہنسی کے ساتھ سب کو دکھائی جاتیں ——— اپنا بہت سا قیمتی وقت انہوں نے اپنے پرانے البم اس کے پیچھے کھڑے ہو کر دکھانے اور ہر تصویر کی تفصیل سمجھانے پر صرف کر دیا تھا۔ پھر وہ اس کے لیے لائبریری سے اچھی اچھی کتابیں بھی لانے لگی تھیں واپس کرنے دونوں ساتھ جاتے تو راستے میں کتاب پر تبصرے بھی ہوتے کہ اچانک ایک دن سلمان نے اس سے کہا:

"اجی یار..... ناشتے میں باسی چیزیں مزا نہیں دیتیں۔ تازہ پھل ہی اچھے لگتے ہیں۔ رات وات کا کھانا ہو تو دوسری بات ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" سن سے اس کے جسم میں کوئی چیز دوڑی تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں کراچی میں ایک سے ایک اچھا دانہ موجود ہے تو سڑی ہوئی املی پر گرنے سے فائدہ؟"

"بھیا قسم لے لو، میں تو.... حد ہے.... سچ مچ یقین کرو...."

"اے بھائی تم تو ابھی بچے ہو اسی لیے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ مجھ پر بھی عنایتوں کی یہ بارش ہو چکی ہے، میں نے کہا بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا... دیکھو اصول نمبر ایک ہے کہ یا تو آدمی کو کھائے نہیں اور اگر کھائے تو پھر پلیٹ میں سجا کر چھری کانٹے سے کھائے۔ یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم صاف ستھرا تو ہو...."

"اُف بھیا کیا گندی بات ہے۔" اس کی جگہ کوئی لڑکی ہوتی تو اسے سچ مچ اُبکائی آ گئی ہوتی۔

"گندی ہو یا صاف یہ کام کی باتیں ہیں۔ انہیں پلو سے باندھ کر رکھو پلو سے۔" وہ دن اور آج کا دن۔ اجمل شمسہ آپا کے قہقہے صرف دُور سے سننے کا گناہگار تھا۔

لڑکیاں ابھی تک ہنسے جا رہی تھیں، یہ باجی رخسانہ کیسے ہنستی ہیں جیسے کوئی ٹٹیری
پکارتی چلی جائے "ٹٹیری ہوں پیاسی ہوں۔ ٹٹیری ہوں پیاسی ہوں۔" اور خالو کیسے
ہنستے ہیں ہر وقت ہنسنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں مگر کیسی کھسیانی سی ہنسی ہے
جیسے ہنسی کی معذرت ہو اور گپّی چچا، دوسروں کی باتوں پر کم ہنستے ہیں، اپنی باتوں پر
زیادہ اور ہنستے ہوئے ایک ایک کی طرف کیسے فرمائشی انداز میں دیکھتے جاتے ہیں
جیسے کہہ رہے ہوں ارے بھئی تم بھی ہنسو نا۔ دیکھو کیا مزیدار بات کہی ہے میں نے۔ اور
ماموں آنکھوں کو میچ کے کیسے ہنستے ہیں۔ ہی ہی ہی ہنستے ہی چلے جاتے ہیں۔ واقعی ہنسی
کی آوازیں بھی کیسے کیسے غم اجاگر کر دیتی ہیں۔ ابا کیسے رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر ہنستے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے جیسے ہنسی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کو ان کے حضور باقاعدہ
درخواست دینی پڑتی ہے اور پاسپورٹ اور ویزا لے کر بے چارہ باہر آتا ہے اور بھیا کے
قہقہے بلند و بانگ جیسے پکار پکار کر کہہ رہے ہوں۔ لوگو سنو میں ہنس رہا ہوں اور دیکھو میں
کتنا زندہ دل ہوں، کیسا خوش مزاج ہوں۔ کتنا خوش ہوں۔ مگر اندر سے ڈھول کے پول۔
...... لیکن اس کی ہنسی، کیسی صاف ستھری بے لوث ہنسی ہے جیسے مندروں میں
گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جیسے ...... جیسے صاف شفاف بلّوریں برتنوں کے ٹکرانے
کا ترنّم۔ اس ہنسی میں نہ کوئی غم چھپا ہوا ہے نہ کسک ہے، نہ بناوٹ ہے، نہ دکھاوا۔
کچھ لوگ کیوں اتنے معصوم ہوتے ہیں۔ کیوں اتنے پیارے ہوتے ہیں اور پھر سب لوگ
ایسے کیوں نہیں ہوتے .... آج کتنی معصومیت سے اس نے کہا تھا: "بس آپ دن
میں ایک مرتبہ یہاں آیا کریں۔"

"کیوں؟"

"بس ....." کہہ کر وہ ہنسی تھی اور پھر اس نے کہا تھا:

"پتہ نہیں کیا ہے لوگوں کو .... باتیں بناتے ہیں کہ ....." اس کی زبان اٹکنے

لگی تھی۔

"مگر یہ چھوکرا نہ جانے کس کے چکر میں یہاں آتا ہے۔ ہے نا؟"

پھر وہی صاف شفاف بلّوریں ہنسی۔

"ہاں بھئی لوگ اچھی باتوں میں بھی بُرے پہلو نکال لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے آج سے میں دن میں ایک دفعہ آیا کروں گا، جس وقت تم کہو۔"

"جب آپ کا دل چاہے۔"

"اور اگر میرا دل نہ چاہے؟"

"تو آپ کی مرضی —" یہ کہہ کر وہ ہنسی نہیں تھی بلکہ اس کی لمبی بڑی آنکھوں میں اُداسی بھر گئی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہوں "کیا ایسا بھی ہوگا کہ تمہارا دل نہ چاہے۔"

"یہ لو۔۔۔ یہ کچھ پیسے ہیں۔ اپنی ماں کو دے دینا۔" اجمل نے اپنا بٹوہ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ جس میں اس کے اس ماہ کے وظیفے کے بچے ہوئے پیسے تھے۔ اور مہتابی نے اسی ادا سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

"آپ کیوں دیتے ہیں، ہمیں ضرورت ہی نہیں۔ سلائی سے بھی پیسے آ جاتے ہیں۔"

"نہیں میرے پیسے اچھے نہیں لگتے؟"

"نہیں۔" اس نے گردن کے اشارے سے کہا تھا اور اس وقت بھی اس کی آنکھیں زخمی تھیں جیسے لین دین کے اس تعلق پہ رو رہی ہوں۔

"میں سمجھ گیا۔۔۔۔ اچھا تو میں کل سب کے لیے لاؤں گا تاکہ تمہیں بُرا نہ لگے۔"

اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اجمل نے سوچا تھا۔ گھر ہی گھر میں پچاس ساٹھ روپے تو ہو ہی جائیں گے۔ مگر یہ سکیم فیل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ گھر کے سب لوگوں کو آزما لیا تھا۔ نانی، سلمان بھیا اور قومی شعور والے خالو نے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ سیاسی شعور والی ممانی نے کنتھے ہیں "لنتھ" "اہنوا ایک روپے کا نوٹ نکال کر دیا تھا اور امّی نے بہت

تیر مارا تو پانچ روپے۔ لڑکیوں نے دو، دو، چار، چار روپے صرف اس کا دل رکھنے کو دے دیے تھے۔ باجی رخسانہ اور تہمینہ سگی بہن ہونے کے ناطے ایسے وقت بھی اڑ جاتی تھیں اور ابا سے مانگنے کی تو اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اور کہیں بال کی کھال نکالنا شروع کر دیں وہ اندر آیا، الماریوں میں پرانے اخبار اور کتابیں ٹٹولنے لگا۔ پھر اسے ہنسی آئی۔ واہ میاں اجمل جہاں تجارت میں ہزاروں نہیں، کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا ہو، بڑے بڑے سیٹھ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔ وہاں تمہاری ردّی کا سودا کرنے کون بیٹھا ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ کسی سے قرض لیا جائے مگر دوست تو ایک سرے سے سب نکمّے اور حرام خور ہیں۔ اپنا وقت آتا ہے تو کیسی مسمّی شکل بنا کر آ جاتے ہیں۔ مگر جب وہ کوئی چیز مانگتا ہے تو ایک سے ایک چھٹا ہوا بہانہ تیار ہوتا ہے۔ کتاب ہے تو پہلے ہی کوئی مانگ کر لے گیا، اسکوٹر ہے تو خراب پڑا ہے، سائیکل ہے تو پنکچر ہے۔ کیسے فضول دوست ہیں سب اس کے۔ کیوں نہ بارش کے بعد وہ اپنے دوستوں کو بھی اوور ہال کر ڈالے ہاں بہار کالونی والا دوست تو پُرخلوص ہے مگر بے چارے کے پاس ہے ہی کیا جو دے اور ..... وہ بھی تو ..... جب سے اسے پتہ چلا ہے کہ میرے لیے لڑکیوں کی تلاش ہو رہی ہے۔ موقع بے موقع اپنی بہن کو دروازے کے پاس بلاتا رہتا ہے۔ کبھی چائے کی فرمائش کرتا ہے۔ کبھی شربت کی۔ ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز دینی ہے تو پردا ہٹا دیتا ہے۔ کھانے پر جو مزیدار چیز ہوتی ہے ہمیشہ بہن کے ہاتھ کی ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ جب بہن اس سے عمر میں بڑی ہے تو اجمل سے بھی بڑی ہوگی ..... ہائے مگر بیچارے بھائیوں کی مجبوریاں، کیوں کسی کو بُرا کہا جائے۔ ہر شخص کسی نہ کسی مجبوری میں مبتلا ہے اور لڑکیوں کی بھی مجبوریاں ہیں۔ کوئی غریب ہے شادی نہیں ہوتی۔ کوئی ان پڑھ ہے۔ کوئی کالی ہے۔ ہر بھائی کے دل پر بہن کا بوجھ ہے۔ کیا خود ان دونوں بھائیوں نے اپنے دوستوں کی فہرست اس لیے نہیں ٹٹولی ہے کہ شاید ان میں یا ان کے بڑے بھائیوں

میں کوئی ان کی سگی یا خالہ زاد بہنوں کا ہاتھ پکڑنے والا نکل آئے۔ اُفوہ! یہ شام کتنی لمبی ہو گئی ہے۔ ورنہ وہاں آتے جاتے کس مزے سے گزر جاتی تھی۔ مگر اب حکم مل گیا ہے دن میں صرف ایک مرتبہ آیا کرو۔ حکم! کیا اس کی زبان سے حکم بھی نکل سکتا ہے نہیں ایک میٹھی سی درخواست اور پیاری سی ہنسی۔ اس ہنسی کی لذت آگیں تصور سے زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانے اور شام کا یہ نہ کٹتا ہوا وقت کاٹنے وہ ٹہلنے کے ارادے سے باہر نکل گیا۔

سڑکوں کا بیچ کا تھوڑا سا حصہ خشک تھا مگر کنارے پانی سے لبالب تھے کہیں کہیں ڈھلان پر ساری سڑک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس سے بچ کر کناروں سے نکلنا پڑا۔ میٹھی ہنسی کی پھواروں میں گم وہ ایک کھلے مین ہول میں گرنے سے بال بال بچا اور تصور کی دنیا سے نکل کر گردوپیش کی دنیا میں آپہنچا۔ خشک دنوں میں اس نے دیکھا تھا کہ یہ مین ہول جس میں لوہے کی سیڑھیاں چلی گئی تھیں۔ کنوئیں کی طرح گہرا تھا۔ اب وہ لبالب بھرا ہوا تھا۔ تین آدمی ایک دوسرے کے سر پر کھڑے ہو کر اس میں مزے سے ڈوب سکتے تھے۔ پتلی سی سڑک کے ہر موڑ پر ایک مین ہول اسی طرح کھلا پڑا تھا اور آجکل ان میں سے ہر ایک بذاتِ خود ایک چھوٹا سا سمندر تھا۔ تعجب ہے کہ ان میں کسی بچے کی ڈوب مرنے کی اطلاع اب تک نہیں آئی تھی، حالانکہ بچے تو بچے چلتے پھرتے آدمیوں اور اسکوٹر سواروں کا اس میں گر کر غائب ہو جانا بھی بعید از قیاس نہ تھا کہ۔ ڈی۔ اے کے دفتر کے احاطے میں اس نے مین ہول کے ڈھکنوں کے پہاڑ کے پہاڑ سجے دیکھے تھے۔ اے کاش! کوئی ان ڈھکنوں سے مین ہولوں کو ڈھانک دیتا اور زندگی کے ہزار خطروں میں سے ایک ہی خطرہ نکل جاتا۔۔۔ کیا اللہ میاں کے ہاں بھی رزق کے پہاڑ یوں ہی سجے ہوں گے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کہیں زندگی دینے والے کو ترس رہی ہے۔ اس ملعون خیال سے لرز کر اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور سہمانی

بتانے کے لیے منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ گھٹاؤں نے تو جیسے کراچی کے آسمان کا ٹھیکہ لے لیا تھا۔ کالے بادل شام کی سرخی سے ہولی کھیل رہے تھے۔ سامنے دیوار کی طرح سیدھے چلے گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر چند لوگ شہتیروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ حضرت نوحؑ کے خاص الخاص چیلے ہوں اور انہیں نسلِ انسانی کی بقا کا کام سونپا گیا ہو۔ پہلے دن جب وہ لڑکیوں کے ساتھ اس پہاڑ کی تسخیر کے لیے نکلا تھا تو کسی نے اعلان کیا تھا کہ اس پر چڑھنا ممکن نہیں کیونکہ یہ دیوار کی طرح سیدھا ہے۔ اس پر رجیلہ نے پہاڑ کی چوٹی کے لمبے سلسلے کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا:

"اگر یہ ناقابلِ تسخیر ہے تو وہ لوگ وہاں کیسے پہنچے۔"

تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پر وہاں کسی کے کھڑے ہونے کا گمان گزر رہا تھا:

"ارے یہ تو کھمبے ہیں۔"

سجیلہ نے بڑے یقین سے فرمایا تھا اور تھوڑی دیر بعد جب اس نے سب کی توجہ ادھر کر کے کہا تھا:

"لو بھئی کھمبے تھک کر آرام کرنے بیٹھ گئے ہیں۔"

تو لڑکیوں کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا تھا۔ سجیلہ کئی دن اس بات پر اس سے بھولی رہی تھی کیونکہ لڑکیوں کے ساتھ مل کر وہ کہتا رہا تھا:

"ہاں بھئی! ٹھیک تو ہے۔ اتنی دور کون دیکھنے جا رہا ہے کہ کھمبے کھڑے ہیں یا بیٹھے ہیں، اگر ذرا سستا لیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔"

یہ تو طے ہو گیا تھا کہ پہاڑ کی مہم سر ہو سکتی ہے مگر ان لڑکیوں کے ساتھ جتنی مرتبہ بھی گیا۔ پہاڑ پر نہ چڑھا جا سکا۔ ذرا دور پہنچ کر ہی وہ ہائے واویلا ڈال دیتیں۔ کسی کا جوتا نیچے رہ جاتا، کسی کی کمر میں چک آجاتی، کوئی چڑھائی کی طرف دیکھ کر ہی نیچے بیٹھ

جاتی۔ انہیں نازک مزاج اور ڈرپوک بنتے میں جانے کیا مزا آتا تھا۔ اجمل نے تو ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں۔ جو مردوں کے دوش بدوش بوجھ اٹھاتی تھیں۔ ان کے گھر کے آس پاس کتنے ہی نئے مکان بن رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے اب تو کام رک گیا تھا اور نیو پڑے ہوئے مکان کا ہر کمرہ چھلکتے جام کی طرح لبریز تھا مگر خشک دنوں میں اس نے کتنی ہی گھاگرہ چولی پہنے ہوئے عورتوں کو مٹی ڈھوتے اور سیمنٹ کی تگاریاں لاتے لے جاتے دیکھا تھا۔ ایسے اطمینان اور خود اعتمادی جیسے وہ عورتیں نہیں مرد ہوں۔ خالی وقت میں ساتھ کام کرنے والے مردوں کے پاس بیٹھ کر وہ اسی اطمینان اور خود اعتمادی سے باتیں بھی کرتی تھیں۔ ان عورتوں کے کام کرنے کی بات نئی نہیں پرانی تھی۔ اسے وہ دلچسپ منظر خوب یاد تھا۔ جب وہ بورڈنگ میں رہتا تھا اور کراچی چھٹیاں گزار کر واپس جا رہا تھا تو سندھ کے ایک اسٹیشن پر اس نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو کام کرتے ہوئے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک مرد باریش وضع قطع جن کی پاکستانی کم اور عربی زیادہ تھی تیشے سے پتھر توڑ رہے تھے۔ یہ منظر عجب اور مضحکہ خیز یوں بھی لگتا تھا کہ ایر کنڈیشنڈ کے بند شیشوں سے پتھر توڑنے کی آواز ذرا بھی نہیں آ رہی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا، جیسے پتھر مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ ایک ذرا سی مار سے بھور بھور ہوئے جا رہے ہیں ایک مرد گارا تیار کر رہا تھا اور عورتیں تگاریاں بھر بھر کر پلیٹ فارم سے نیچے دوسری طرف ڈالتی جا رہی تھیں۔ یہ عورتیں کم گھیر کی تھینٹ کی شلواریں اور گول دامنوں والی شلوار کی ہم رنگ پھول دار قمیصیں اور کسی دوسرے رنگ کی مگر پھولوں والی چادر اوڑھے ہوئے تھیں۔ سر ڈھکا ہوا تھا باقی ساری اوڑھنی پیچھے کی طرف پڑی تھی۔ لباس بھی اس کو یاد رہ گیا تھا مگر قابل دید چیز دراصل ان کا زیور تھی۔ ساری عورتیں ناک کے چھدے ہوئے نتھنوں میں لٹکتا ہوا چاندی کا زیور پہنے ہوئے تھیں۔ گھر میں عورتوں کو ناک میں لونگیں پہنے تو اس نے بھی دیکھا تھا مگر دونوں نتھنوں کے بیچوں بیچ لٹکتی ہوئی ناک جیسا یہ زیور۔

دیکھ کر اسے بہت ہی ہنسی آئی تھی۔ بعض عورتیں اس بلاق کے علاوہ ناک کے ایک طرف اٹھنی برابر لونگ بھی پہنے ہوئے تھیں جن میں رنگ برنگے نگ جڑے ہوئے تھے۔ پھر کلائی میں چاندی کے چوڑے بھی بالکل نئی چیز تھی۔ ایک چوڑے نے ساری کلائی کو ڈھانپ لیا تھا اور بعض شوقین مزاج یا "امیر" عورتوں نے اس چوڑے کے دونوں طرف ایک ایک گول کڑا بھی لگا رکھا تھا۔ بعض بعض عورتوں کے بازوؤں پہ بھی چاندی کے کڑے چڑھے ہوئے تھے۔ مزدور عورتوں میں زیور کی یہ فراوانی اسے بیحد عجیب لگی تھی مگر ساتھ ہی اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ ان عورتوں میں اپنے لباس یا زیوروں کی طرف سے کسی جھینپ یا خفت کے آثار نہیں تھے۔ وہ چاروں طرف کے مردوں کی موجودگی اور نگاہوں سے بے نیاز اپنا کام کیے جا رہی تھیں اور ایک یہ لڑکیاں تھیں کہ گھر سے نکلتی تھیں تو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی انھیں دیکھ رہا ہے۔ ویسے کوئی نہ بھی دیکھتا مگر ہائے ہوتی کہ پر تو دیکھے گا ہی۔۔۔۔۔ نہیں ان کے ساتھ کوئی پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتا۔ سمندروں پہ نہیں جا سکتا اور اسے تو ہمیشہ پہاڑ پہ چڑھنے اور سمندروں کے سینے پر تیرنے کا شوق تھا۔۔۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی دن وہ اس ٹولے کے ساتھ ان پہاڑوں اور سمندروں کے فاصلے طے کرے۔ وہ سخت جان اور ہمت والی ہے۔ اس نے کڑے حالات کے پہاڑ سر کیے ہیں۔ اس نے یتیمی کا دکھ دیکھا ہے۔ اپنا گھر اجڑتے دیکھا ہے، گھر کی ساری چیزیں نظروں کے سامنے بکتی دیکھی ہیں۔ کپڑے اور کورس کی کتابیں جنہیں دوبارہ وہ آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی چیز اس کی پسندیدہ بھی ہو مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ بے فکری سے ہنس سکتی ہے۔ لوگوں کی نظروں کی زد میں ہونے کے باوجود، کم کھانے اور پڑھنے رہنے کے باوجود اس کے چہرے پہ پھولوں کی تازگی ہے اس کی زبان میں پھلوں کے رس ایسی مٹھاس ہے۔ اس نے کبھی اپنی کسی چیز کا ماتم نہیں کیا اور خودداری کتنی ہے کہ کسی بھی چیز کو دیکھ کر انکار میں اس کا سر ہل جاتا ہے اور آنکھوں

میں درد کی لہر دوڑ جاتی ہے جیسے وہ یہ سوچ رہی ہو اگر زندگی میں یہ لینا دینا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا ...... مگر زندگی میں یہ لینا دینا ہے۔ کوئی شخص بھی خود کفیل نہیں ہے کوئی شخص بھی خود مختار نہیں ہے۔ آدمی ایک دوسرے سے ہزار قسم کے بندھنوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ کچھ فطری ہیں، کچھ خود ساختہ ہیں، کچھ دل خوش کُن ہیں۔ کچھ رُوح فرسا ہیں، مگر ہیں، اب کیا کیا جائے ..... مہتابی کا اگر کوئی معقول گھر ہوتا، معقول آمدنی ہوتی۔ اس کی امّی اور بہنیں اسے دیکھنے جاتیں تو واپس آکر زمین و آسمان کے قلابے ملاتیں۔ اتنی لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد ایک خوبصورت، ہنس مکھ، سادہ مزاج لڑکی پاکر وہ کتنی خوش ہوتیں۔ مگر اب کیا تھا اس لڑکی میں، وہ صرف تھیلہ کے چانٹے کھانے کے لائق تھی، کاش کسی طرح وہ ان کے لیے ایک معقول گھر اور معقول آمدنی کا بندوبست کر سکتا ...

..... مگر کیسے؟ ابھی تو وہ خود اپنے پاؤں پہ کھڑا نہ ہوا تھا۔ ابھی تو اس کی آواز کوئی آواز ہی نہیں بنی تھی۔ ابھی تو گھر میں اس کی کوئی معمولی بات بھی نہیں سنی جاتی تھی۔ چہ جائیکہ اتنی بڑی بات —— ہاں اگر بھیّا کہتے تو شاید اسی بات میں کچھ وزن ہو جاتا کیونکہ ان کے بٹوے میں بھی وزن تھا۔ بات اور بٹوے کے وزن میں بہت تعلق ہے۔ اس کا اندازہ اسے کئی دفعہ ہو چکا تھا۔ جس کے بٹوے میں زیادہ وزن ہو وہ آدمی خواہ مخواہ زیادہ ذہین اور قابلِ اعتبار ہو جاتا ہے اور اس کو تو وظیفے کے صرف ستّر روپے ملتے تھے۔ اسی لیے اس کی اکثر باتوں کو مذاق میں اُڑا دیا جاتا تھا یا زیادہ سے زیادہ اسے فلسفی کا خطاب بغیر خلعت کے عنایت ہو جاتا تھا۔ مگر بھیّا ایسی بات کہتے ہی کیوں؟ وہ تو خود کسی بڑے سے محل کے آگے لمبی چوڑی کار میں بیٹھی ہوئی کسی شہزادی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ تو وہ تھا جو بلا وجہ ہی صحیح راہ سے بھٹکا جا رہا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ کتابیں پڑھ پڑھ کر اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ نہ جانے اپنے کام کی کتابیں چھوڑ کر کون کون سی خرافات پڑھتا رہتا ہے۔ یہ لوگ سے معلوم تھا کہ بہت سی باتیں جو وہ سوچتا

رہنا تھا ابھی اس کے لیے قبل از وقت تھیں مگر یوں تو اس کی شادی کا چرچا بھی قبل از وقت تھا اور کیوں تھا۔ یہ بھی اسے خوب معلوم تھا۔ امّی کہتی تھیں:

"بھیّا! میں تو ابھی سے اجمل کے لیے بھی لڑکی تلاش کرتی ہوں سلمان کی دفعہ دیر سے شروع کی تو دیکھو تئیس سال کا ہونے کو آ گیا ہے مگر لڑکی نہیں ملی وہ تو کہو لڑکا شریف ہے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ ورنہ۔۔۔۔ اور بھئی شادیاں جلدی ہی ہونی چاہئیں۔ جب لڑکا اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو جائے تو پھر دیر کا ہے کی۔ خیر سے اپنا اجمل بھی دو سال میں کسی قابل ہو جائے گا۔ لڑکی تیار ہو گی تو جھٹ سے کر ڈالیں گے۔"

مگر اجمل کو پتہ تھا کہ اس کے پیچھے سازش کیا ہے۔ ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈالنے کی۔ یہ جو اس نے سب کی مخالفت کے باوجود مرچنٹ نیوی کا روگ لگا لیا تھا۔ سمندروں میں پھرنے کا، نئی نئی فضاؤں میں اُڑنے کا، دیس دیس گھومنے کا۔ گھر والوں کے نزدیک اس کا علاج تھا شادی۔ شادی کی بیڑی پاؤں میں ڈال دو بیاہ جزادے ابھی نئی دنیاؤں کی سیر بھول کر یہیں رہ پڑیں گے۔ پَر قینچ پرندے کی طرح۔ شرافت سے کسی فرم میں ملازمت کر لیں گے۔ چھوٹی سی نئی یا بڑی سی پرانی گاڑی لے کر ہنسی خوشی رہنے لگیں گے۔ تو یہ تھا سارا فلسفہ اس عجلت کے پیچھے۔ وہ بھی سب کچھ صبر شکر سے سنے جا رہا تھا۔ حالات دیکھتے ہوئے ابھی دس سال تو سلمان بھیّا کے نمٹنے کی امید نہیں تھی، جتنے منہ اتنی باتیں تھیں اس گھر میں۔ ایک خوف ہی ایسی چیز تھا جس پر سب متفق تھے۔ باقی کسی چیز پر نہیں۔ کوئی ہاری چاہتا تھا کوئی بوٹی، کسی کو سیاہ آنکھیں پسند تھیں۔ کسی کو کنجی۔ کوئی سادہ حُسن چاہتا تھا کوئی اسمارٹ نس، کسی کو لمبے بال چاہئیں تھے کسی کو گھونگھر یالے۔ غرض بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ جس میں روڑا اٹکانے کو ایک ابّا بھی موجود تھے۔ جو ایسا چمکتا رنگ چاہتے تھے کہ سو گز سے اپنی

طرف متوجہ کرے اب ایسی لڑکی کہاں مل سکتی تھی سوائے مہتابی کے اور وہ قابلِ غور ہی نہیں تھی۔

واپس آیا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر صحن میں دیکھا سفید چنبیلی کے پھول اندھیرے میں چمکتے ہوئے بڑے پیارے لگ رہے تھے ان کی دھیمی مہک سارے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ زرد چنبیلی کے گچھے چوڑے چوڑے پتوں میں سے منہ نکالے آسمان کے بادلوں کو تک رہے تھے۔ اوپر سے لوگ اتر کر شاید اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو چکے تھے۔ کھانے کا انتظام ہو رہا تھا۔ پلیٹیں رکھنے کی آوازیں آرہی تھیں تو آخر کار یہ شام بھی گزر ہی گئی، بغیر وہاں گئے۔

شاید اس نے انتظار کیا ہوگا ..... نہ جانے اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ وہاں تو سرِ شام کھانا کھا لیا جاتا ہے۔ شاید اس وقت سونے کی تیاری ہوگی۔ کھری بان کی چارپائی پر اسے کیسے نیند آتی ہوگی۔ کسی دن وہ بھی کھری چارپائی پر سو کر دیکھے گا..... کھٹ کھٹ کھٹ اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا، کوئی نہیں تھا..... کیسے کان بج رہے ہیں۔ کچھ دن سے اسے کچھ ہو رہا ہے۔ کبھی آہٹ سی ہوتی ہے جیسے کوئی چپکے سے آ رہا ہو کبھی سوتے سے یکایک آنکھ کھل جاتی ہے جیسے کسی نے دھیرے سے پکارا ہو کبھی لگتا ہے جیسے کانوں کے پاس کوئی منہ لا کر ہنس دیا ہو..... کھٹ کھٹ..... واقعی کوئی ہے؟ یا دردِل پر دستک ہو رہی ہے؟ رات ضرور ہو گئی ہے مگر وہ ابھی سویا تو نہیں ہے..... کھٹ کھٹ۔ نہیں ضرور کوئی ہے۔ شاید غسلخانے کے دروازے پر۔ غسل خانے کا دروازہ کھول کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ دروازہ بند کرنے والا تھا کہ کسی نے سرگوشی کی۔

"اجّی؟"

بڑے بڑے گملوں کی آڑ میں سلمان بیٹھا تھا۔ چھجے کی روشنی سے چھپ کر مگر

اجمل نے دیکھ لیا کہ اس کی پیشانی سے لہو کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ دہلیز تھام کر وہ اٹھا اور جلدی سے اندر آن کر دروازہ بند کر دیا۔

"یہ کیا ہُوا بھیا؟"

"اجمل بات سنو..... آج تک میں نے تمہارا راز چھپایا ہے۔ آج تمہیں میرا راز چھپانا ہے۔"

"میرا راز؟ کون سا راز؟"

"مجھے معلوم ہے دھوبی کا گٹھر کون لے گیا تھا اور کہاں لے گیا تھا۔ خیر اب میری بات سنو۔ پچھلی دیوار کی طرف درختوں کے جھنڈ میں میری گاڑی کھڑی ہے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، میں پولیس کے ڈر سے بھاگ کر آ گیا ہوں۔ تم یہ کرو..... یہ کرو کہ اس میں جو لڑکی بیٹھی ہے اسے ذرا..... وہ جو نئے مکان بن رہے ہیں نا ...... خیر وہ تمہیں خود ہی بتا دے گی۔ تم اسے چھوڑ کر جلدی سے واپس آؤ اسی غسلخانے کے راستے سے۔ اس وقت تک میں کسی کو اطلاع نہیں دوں گا اور یہیں رہوں گا.. ...... اور دیکھو اسے اپنا گھر نہ بتانا ہرگز۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ تم میرے..... کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔"

"مہتابی ہے اس میں — ؟" کچلے سانپ کی طرح وہ پھنکار اٹھا تھا۔

"نہیں اس کا نام شکیلہ ہے۔"

ہاں یہ تو وہ بھول ہی گیا تھا کہ مہتابی نام خود اس کے ذہن نے دیا تھا۔ اس کا اصل نام تو شکیلہ تھا۔ غسل خانے کی سیڑھیاں پھلانگ کر، پچھلے دروازے سے وہ یوں نکلا جیسے اب کبھی اس گھر میں واپس نہ آئے گا۔ پچھلے جھنڈ میں گاڑی کھڑی تھی۔ ایک طرف سے پچکی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ سامنے کی ایک بتی بھی ٹوٹی ہوئی تھی اور ونڈ اسکرین چور چور تھا۔

"مہتابی، شکیلہ ......" دروازہ کھول کر قریب تھا کہ وہ اسے اپنے سینے سے چمٹائے اور اتنے بوسے لے، اتنے بوسے لے کہ زندگی بھر کسی مرد نے کسی عورت کے نہ لیے ہوں ... مگر سیٹ خالی تھی، پچھلی بھی اور اگلی بھی۔ احتیاطاً اس نے نیچے دیکھا۔ سڑک پر چاروں طرف دیکھا، درخت پر بھی دیکھا مگر مہتابی کہیں نہیں تھی۔ وہ ڈرائیور کی سیٹ پہ بیٹھ گیا اور آگے چلا۔ ایک بتی تھی وہ بھی اندھی ٹوٹے ونڈ اسکرین کے پار تارے سے ناچ رہے تھے۔ اور وہ مہتابی کو ڈھونڈتا ہوا چل رہا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کتنی دور جا سکتی ہے مگر اتنی گلیوں میں اتنے مکانوں میں وہ اسے کہاں ڈھونڈے عقل سے زیادہ وجدان سے کام لیتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ آس پاس کی گلیوں کی بھول بھلیاں دیکھنے کے بعد مین روڈ پہ آ گیا۔ اس کی منزل وہی مکان تھا جو اس وقت مہتابی کا ٹھکانہ تھا۔ کاروں بسوں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں کا ایک سیلاب سڑک پہ رواں تھا۔ اس تیز رو قافلے میں گھس جانا بڑا مشکل تھا۔ کسی کو ایک لمحہ کی دیر گوارا نہیں تھی اور اسے تو لمحے کے ہزارویں حصے کی بھی نہیں۔ جان کو خطرے میں ڈال کر وہ چلتے ٹریفک کی بھیڑ میں گھس گیا۔ اب بھی اس کی نگاہیں بھٹک رہی تھیں۔ جیسے ہر چلتی گاڑی میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اس کی سست رفتاری سے الجھ کر لوگ دائیں بائیں سے گزر رہے تھے اور اس پہ بگڑتے جا رہے تھے مگر وہ ان کے بگڑے تیوروں سے بے نیاز تھا۔ اسے صرف چلنا ہی تو نہیں تھا۔ کسی کو تلاش کرتے چلنا تھا۔ جہاں جہاں اس کا دل چاہا، جہاں جہاں اسے شبہ ہوا جہاں جہاں دل نے گواہی دی وہ مڑ گیا اور اسے ڈھونڈتا رہا۔ بالآخر وہ اس مکان تک آ پہنچا اور فاصلے پر ایک گلی میں گاڑی کھڑی کی اور اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ذرا ہوش میں آ کر جاؤ۔ روزمرہ کی طرح کچھ اور نہ کہہ بیٹھنا۔ تمہاری اور اس کی عزت کا سوال ہے۔ باری باری اس نے سب کو پوچھا اور سب سے آخر میں اس کی ماں کو۔ وہ بے حد فکرمند

سی دروازے میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی:

"بیٹا! میں بڑی پریشان ہوں۔ شام کو شکیلہ دوکان پر ٹماٹو لینے گئی تھی ابھی تک لوٹ کے نہیں آئی . . . . ہائے میری بچّی کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اتنی دیر میں تو سو دفعہ آجاتی، خدا کے لیے اسے ڈھونڈ لاؤ۔"

"اچھا اچھا ابھی جاتا ہوں، دوکانوں کی طرف گئی تھی نا؟"

اندھوں کی طرح ٹٹولتا وہ باہر چلا۔ برابر کے کمرے میں سے کوئی کہہ رہا تھا:

"میں نے خود اسے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا ہے مگر بڑھیا یقین بھی کرے۔"

"آجائے گی پھر تو . . . . . فکر کی کیا بات ہے۔" کسی دوسرے نے کہا اور پھر ایسے بے درد قہقہے ابھرے جو اس کے دل کو چیرتے چلے گئے۔

اندھی گاڑی کو لے کر وہ پھر کراچی کی تاب ناک سڑک پر نکل گیا مگر اب کہاں جائے شاید وہ گھر کے نزدیک ہی کہیں ہو۔ شاید وہ ان کے گھر کے بے شمار بڑے بڑے گملوں کے درمیان کہیں چھپی بیٹھی ہو۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ گھر اس کا ہے . . . . اس کا بھی ہے۔ وہ گھر واپس آگیا۔ ایک بار اس نے پھر درختوں کے جھنڈ کو مایوسی سے دیکھا۔ احاطے میں گھسا۔ چاروں طرف نگاہ ڈالی مگر وہ یہاں نہیں تھی۔ غسل خانے کے بھڑے ہوئے دروازے کو دھکا دے کر وہ اندر گیا۔ سلمان ابھی تک غسل خانے کے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ گیلی تولیہ اس کے ماتھے پر رکھی تھی جو خون سے گلنار ہو رہی تھی۔

"چھوڑ آئے — ؟" وہ بولا۔

"بھیا! یہ تم نے کیا کیا . . . . . یہ تم نے کیا کیا —" وہ سنک سے ٹیک لگا کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگا اور پھر چکنی دیوار سے لگ کر پھسلتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں اجّی، میں ٹھیک ہو جاؤں گا، تم کیوں اتنی فکر کر رہے ہو؟"

غصے کی ایک بے پناہ لہر اجمل کے ذہن پر نشے کی طرح چڑھتی چلی گئی۔ اگر سلمان کے ماتھے سے خون نہ نکل رہا ہوتا۔ اگر وہ پہلے سے ہی اتنا مُردہ اور زرد نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کا گلا دبا دیتا۔ وہ صرف اپنی انگلیوں کو تشنجی ارتعاش دے کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون دیکھ کر سلمان نے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"تم نے اسے زبردستی اپنی گاڑی میں بٹھایا؟"

"نہیں ـــ وہ جانتی تھی کہ میں تمہارا بھائی ہوں.... ایک دفعہ میں نے اسے بتایا تھا.... وہ دوکانوں کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اسے گاڑی میں گھر چھوڑ دوں گا۔ رات کو اس کا پیدل اتنی دُور جانا ٹھیک نہیں۔"

ایک مرتبہ پھر اجمل کا دل چاہا کہ اس شخص کا جو اس کا بھائی تھا گلا دبا دے۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر قطعی غیر مانوس آواز میں بولا:

"صبح میں اس کے ہاں جاؤں گا، اس وقت تک وہ گھر پہنچ گئی ہو گی۔ میں اسے اور اس کی ماں کو یہاں لے کر آؤں گا اور تمہیں اس سے شادی کرنی ہو گی۔"

"شادی؟ کیا بک رہے ہو؟ دیکھو جلدی سے میرے ماتھے پر پٹی باندھ دو، مجھے پلنگ پر لٹا دو اور سب کو بتا دو کہ میری گاڑی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"کیا تم اس سے شادی نہیں کرو گے؟"

"نہیں۔"

"اگر تم اس سے شادی نہیں کرو گے تو میں کروں گا۔"

"کر لینا ـــ الماری سے دواؤں کا ڈبہ نکال لاؤ۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ دیکھو کتنا خون نکل گیا ہے۔" اس نے پیشانی سے تولیہ ہٹایا تو خون ٹپ ٹپ غسل خانے کے فرش پر گرا۔

"مجھے قسم ہے تمہارے اس بہتے لہو کی۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میں

نہیں...... میں نہیں......" وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اپنے کمرے سے گزر کر اندر کے برآمدے میں چلا گیا وہاں پہنچ کر ایسی آواز میں جیسے برسوں پرانی قبر سے کوئی مُردہ بول رہا ہو اس نے کہا:

"بھیا کی کار کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا۔"

ایک ساتھ کئی چیخیں بلند ہوئیں۔ کب؟ کہاں کے جواب میں اس نے صرف کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگ بے تحاشا ادھر لپکے، وہ پیچھے سرک گیا۔ پل بھر میں بات پھیلتی چلی گئی۔ نانی چیخنے لگیں۔ لڑکیاں پٹاپٹ گرنے لگیں۔ دوسرے کمروں اور گھروں سے لوگ "کیا ہوا، کیا ہوا" کرتے بھاگے آئے۔ اس افراتفری میں وہ اندرونی زینے سے چھت پر چڑھ گیا اور کسی نے اسے چڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔

کراچی کی رنگا رنگ روشنیاں اسے یوں نظر آ رہی تھیں جیسے بے شمار شعلے، بھساں چنگاریاں آسمان پہ بجلی کے لہریے، سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے اور اس کے دل کے اندر، جسم کے اندر کوئی چیز دھڑا دھڑ سوکھی لکڑی کی آگ بنی جل رہی تھی جس میں اس کی ہڈیاں چٹخ رہی تھیں۔ خون کھول رہا تھا اور جسم لمحہ لمحہ پگھل رہا تھا۔ فنا ہو رہا تھا کچی عمر کی پہلی پہل محبت کراچی کی طوفانی بارش کی طرح بے پناہ ہوتی ہے۔ جو اچھا بُرا کچھ نہیں دیکھتی۔ بس بہائے لیے چلی جاتی ہے۔ آدمی اس سے بچ نہیں سکتا۔ بس ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ بعد میں عمر کی پختگی کے ساتھ جب احساس سود و زیاں بڑھتا ہے تو محبت میں یہ طوفانی کیفیت نہیں رہتی۔ اس وقت انسان اپنی پہلی محبت پر نظر ڈالتا ہے تو اس وارفتگی و جنون پہ حیران رہ جاتا ہے یا بچپنا سمجھ کر مسکرا دیتا ہے۔ چاہنے پر بھی یہ عالم پھر نہیں لوٹتا۔ کچی عمر کا عشق زندگی کا پہلا اور آخری تجربہ ہے۔ اسے دہرایا نہیں جا سکتا۔

ڈریسنگ کے بعد جب ڈاکٹر نے اسے نیند کی گولی دے دی اور سلمان سو گیا تو

سب کو خیال آیا کہ ارے اجمل کہاں گیا۔ اجمل گھر بھر میں کہیں نہیں تھا۔ ہسٹیرک لوگوں پر دہرا دورہ پڑا۔ قیاس آرائیوں کا ایک طوفان امنڈ پڑا۔ شاید وہ ڈاکٹر کو لینے گیا ہو اور اب تک کوئی سواری نہ ملی ہو یا گھبراہٹ میں کسی موٹر کے نیچے آ گیا ہو یا سلمان کے بدلے وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہو یا . . . . یا پتہ نہیں . . . . لڑکیاں بڑائی بڑائی ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک پھر رہی تھیں۔ امی بے ہوش پڑی تھیں ممانیاں اور خالائیں جانماز بچھائے بیٹھی تھیں اور وہ ٹھنڈی یخ اینٹ پر سر رکھے گیلی بجری پر لیٹا کروٹوں پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ گیلی بجری آگ کی لپٹوں کی سیج تھی۔ اور ٹھنڈی اوس سیدھے جہنم سے گرنے والے قطرے تھے جو اس کی جلتی روح کو اور جھلسا رہے تھے۔

صبح اس سے پہلے بھی ہوتی تھی مگر ایسی بے رنگ صبح کبھی نہ ہوئی تھی۔ صبح کا تارا کسی معصوم خوبصورت اور بے گناہ لڑکی کی طرح آسمان پر تنہا بے بسی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ سورج خود برآمد ہونے سے پہلے اپنی ترچھی کرنوں کے بان زخمی دل میں چبھوئے ہوئے کچوکوں کی طرح آسمان کے سینے میں اتار رہا تھا۔ رات کی روشنیاں بجھ گئی تھیں۔ چاروں اور ایک ملگجا سا اجالا تھا۔ کسی پریشان حال کے دل کی طرح بے یقین و بے آسرا اجالا۔ وہ تازہ قتل کرنے والے قاتل کی طرح نیچے اترا اور مخمور شرابی کی طرح سڑکوں پر بے مصرف و آوارہ پھرنے لگا۔ نہ اس نے گڑھے دیکھے نہ پانی۔ نہ کیچڑ کی پرواہ کی نہ اپنے حلیے کی۔ بس چلتا رہا، چلتا رہا۔ سڑکوں کے دونوں طرف پانی کے لمبے لمبے تالاب چلے گئے تھے۔ جہاں اس وقت بھی اکا دکا لڑکے مہارت سے تیر رہے تھے۔ ایک جگہ سویج پائپ میں پورا کنبہ پناہ لیے پڑا تھا۔ بچے گڑ مڑ یا ہوئے پائپ میں سو رہے تھے۔ باپ کھاٹ پر بیٹھا حقہ پینے میں مصروف تھا اور ماں بچوں کو جگانے کی تیاری میں مصروف تھی مگر اس کے

لیے یہ سارے منظر بھولے بسرے خواب کی طرح دھندلے اور غیر حقیقی تھے جیسے اس نے آنکھوں میں چکنائی بھر رکھی ہو۔ جس وقت وہ منزلِ مقصود کے نزدیک پہنچا صبح ہو چکی تھی۔ لوگ اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ بعض گراں خواب ابھی تک سو رہے تھے ملگجی، میلی، پھٹی چادریں پلنگوں پر پڑی تھیں۔ بڈھے چارپائیوں کی اودانوں پر بیٹھے کھانس رہے تھے۔ بڑھیا عورتیں مٹی کے بدھنوں میں پانی لیے منہ دھو رہی تھیں چھوٹے بچے قمیصیں اٹھائے جگہ بے جگہ بیٹھے تھے۔ کمروں کے اندر باسی برتن فرش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اتنی صبح آنا اس کا کسی طرح مناسب نہیں تھا مگر کیا اس وقت مناسب اور نامناسب باتوں کا اسے ہوش تھا۔

"مجنوں۔" کسی لڑکے نے دانتوں کی صفائی کے لیے کوئلے کو منہ میں چباتے ہوئے کہا۔

کمرے میں پہنچ کر بغیر کچھ کہے سنے پاگلوں کی طرح وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک بڑی بی اس کا مدّعا پا گئیں اور بغیر پوچھے بولیں:

"شکیلہ تو آئی نہیں رات ہی کو اس کی ماں ڈھونڈنے نکل گئی تھی۔ تو اب تک وہ بھی نہیں لوٹی۔"

"اب وہ کیا آئے گی" بنیان اور تہمد میں اکڑوں بیٹھا ایک شخص خاص طور پر اجمل کو سنانے کے انداز میں بولا:

"ملی بھگت تھی، ماں بھی وہیں پہنچی ہو گی جہاں لڑکی گئی۔"

"ہاں میرا بیٹا کہوے تھا۔ اس نے شکیلہ کو ایک گاڑی میں بیٹھتے دیکھا ہے، خدا جانے سچ یا جھوٹ . . . . کراچی بہت بُری جگہ ہے بیٹا . . . بہت بُری۔"

ایک دروازے سے گزر کر وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ آج کمرہ خالی تھا۔ گھڑی کی سوئی ننھی منّی سی کوئی آواز نہیں تھی۔

"افسوس تو ہو گا ہی بیچارے کو، دانز اس غریب نے ڈالا تھا لے اُڑا کوئی اور" تہمد والا تمسخر سے بولا۔ نزدیک کسی مکان کے ریڈیو سے خبروں کی آواز ابھری۔ کراچی میں اور بارش کا اعلان ہُوا۔ اور ساتھ ہی تڑا تڑ بوندیں یوں پڑنے لگیں جیسے وہ اس پلیشں گوئی کی منتظر ہی بیٹھی ہوں۔ ابھی تو وہ صبح کا تارہ ٹمٹماتا چھوڑ کر اور سورج کو نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا دیکھ کر آیا تھا اور اسے احساس بھی نہیں ہُوا تھا کہ اتنی دیر میں آسمان پر پھر بادلوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ بوندیں بغیر رُکے برسے جا رہی تھیں۔ پہلے کے بھرے ہوئے گڑھوں میں گرتی بوندیں یوں لگ رہی تھیں جیسے بے شمار کلبلاتے کیڑوں نے ہلچل مچا دی ہو۔ بارش صرف خوبصورت جگہوں پر گرتی ہی اچھی لگتی ہے۔ یہاں کی غلاظت میں بارش مزید غلاظت کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اجمل چپ چاپ کھڑا بارش میں ادھر ادھر بھاگتے اور پھسلتے ننگے بچوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب وہ اسے کہاں ڈھونڈے...... اس شہر کراچی میں جہاں ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ جہاں ڈوب مرنے کے لیے لیاری یا کیماڑی جانا ضروری نہیں تھا۔ وہ اسے کہاں ڈھونڈے، کہاں ڈھونڈے؟

بوڑھا پاگل جو صبح سے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ یکایک پکار اٹھا:

"آگ، پھر آگ...... دیکھو کراچی میں کیسی آگ لگی ہے۔"

اور اجمل نے سوچا۔ ٹھیک تو کہتا ہے بڈھا۔ کیسی ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ زمین سے آسمان تک، دل سے ذہن تک ہر چیز جل رہی ہے...... جل رہی ہے۔ بڈھا واقعی جانتا ہے۔ آگ پانی سے نہیں بجھتی۔ آگ جب لگتی ہے تو کسی چیز سے نہیں بجھتی۔ خاک کر کے ہی بجھتی ہے، راکھ ہو کے ہی بجھتی ہے۔

پہلی دراڑ

جب کبھی اس واقعہ کا خیال آتا ہے کچھ عجیب سی میری حالت ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یکایک میرے دل سے خون رسنے لگا ہے جو میرے سینے سے باہر نکلتا — سارے بدن پر بہتا زمین پر گر رہا ہے۔ جب تک میں اپنے آپ کو کسی کام میں غرق نہ کر دوں یہ رستا ہی رہتا ہے۔ لگتا ہے قطرہ قطرہ ٹپکتا لہو سارے کا سارا جسم سے نچڑ جائے گا اور میں خالی ہو کر نعش کی طرح گر پڑوں گا۔

اسی لیے میں اس سارے واقعہ کو بھلائے رکھتا ہوں۔ لیکن ساری باتیں ہی تو اپنے بس میں نہیں ہوتیں، دنیا والے بھی تو بہت سی باتیں نہیں بھولنے دیتے اور کسی کو خبر بھی کیا کہ انسان کو کس چیز سے کون سی بات یاد آتی ہے۔

اب یہ کون جانتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے جب کبھی لائٹ آف ہو جاتی ہے تو میں فوراً امجد کے گھر پہنچ جاتا ہوں۔ پہلے دن جب شام رات میں بدل رہی تھی۔ گملوں میں لگی اور ستونوں پر چڑھی بیلیں ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔ میں برآمدے کی سیڑھیوں پر جب پہلے

بیٹھا تھا۔ اس لیے کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں نے بہت مرتبہ گھنٹی بجائی تھی تو بجائے دروازے کے کھڑکی میں سے ایک چہرہ جھانکا تھا اور ایک شیریں سی آواز آئی تھی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

"امجد سے۔"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔"

یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ گھر پر کوئی مرد یا نوکر نہیں ہے۔ اب اس حسین آواز کی رعایت سے ہو سکتا ہے کوئی بڑی بی کسی کونے میں پڑی ہوں ــــ جب شام رات میں بدل رہی ہو۔ عمارتوں کے درمیان سے نظر آنے والے آسمان پر شفق پھولی ہو، گملوں میں لگی اور ستونوں پر چڑھی بیلیں ہولے ہولے ہل رہی ہوں اور کوئی نادیدہ چہرہ جھانک کر میٹھی آواز میں یہ کہے کہ جس سے آپ کو ملنا ہے وہ گھر پر نہیں ہے تو اس عمر میں آدمی خواہ مخواہ رومانی سا ہو جاتا ہے اور کوئی شرارت بھری بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا: "ظاہر ہے۔ امجد ہوتے تو مجھے اتنی دیر باہر نہ کھڑا رہنا پڑتا۔"

ہنسی کی ایک کھنکھناہٹ سی ابھری اور میرے دل کو بڑی تقویت ہوئی جیسے آدمی بھری محفل میں کوئی لطیفہ سنائے اور اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔

"کب تک آئیں گے وہ؟" میں نے بات آگے چلائی۔

"اب آتے ہی ہوں گے۔ ایئرپورٹ پر کسی رشتے دار کو چھوڑنے گئے ہیں سب لوگ آپ انتظار کریں گے؟"

"کر لوں گا۔"

"کرسی بھجوا دوں؟"

"اگر زمین پر بیٹھا ہوا نہ لگ رہا ہوں تو بھجوا دیجئے۔"

ہنسی کی ایک اور کھنکھناہٹ، پھر خاموشی ـــــ
میں واپس جا سکتا تھا۔ کچھ دیر گھوم گھام کر بھی آ سکتا تھا اور یوں مجھے امجد
سے کون سا ضروری کام تھا۔ صرف نوکری کا ایک اشتہار اسے دکھانا تھا جو بہت
ممکن ہے وہ خود بھی دیکھ چکا ہو۔ انجینئرنگ کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں
ہم کئی ماہ سے اکٹھے جوتیاں توڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اشتہارات دکھانے
عرضیاں لکھنے لکھانے اور انٹرویو کے لیے ایک دوسرے کی چیزیں مستعار لینے
ہم روز ہی تو ملتے تھے۔

پھر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ میں سیڑھیوں پر بیٹھا آسمان پر پھیلی شفق کو دیکھتا
رہا اور امجد کا انتظار کرتا رہا یا شاید اس موعود کرسی کا۔ امجد کیوں مجھے اپنے گھر آنے
سے باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا؟ یہ سوال بھی اس وقت میرے ذہن میں اُٹھا۔
ہم اب کئی سال سے دوست تھے مگر وہ یا تو میرے گھر آ جاتا یا کہیں اور ملاقات
کی جگہ طے کرتا۔ اگر میں اس کے گھر آنے کا ذکر کرتا تو فوراً کسی پکچر کا پروگرام بنا کر
وہاں ملنے پر اصرار کرنے لگتا یا کسی دوست کے گھر جانے کو اچانک اس کا دل
مچل اٹھتا۔ پہلے تو میں نے سوچا چلو نہیں چاہتا تو نہ سہی مگر اب مجھے اس پر غصّہ
آنے لگا تھا۔ لعنت ہے ایسی دوستی پر جب آدمی اپنے دوستوں کو اپنے گھر
لے جاتے شرمائے ـــ وہ ایسے خراب علاقے میں بھی نہیں رہتا، یہ مجھے
معلوم تھا اور ظاہری حُلیے سے بھی فاقہ مستی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔
فارم وارم بھرنے کے چکر میں جب مجھے اس کے گھر کا نمبر ازبر ہو گیا تو آج میں
بغیر اطلاع دیے آیا اور حیران ہُوا کہ اس کا مکان میرے گھر سے کئی گُنا اچھا تھا۔
عموماً لوگ اپنے گھر یا گھر والوں سے ہی شرماتے ہیں۔ میں نے چاہا کہ اب آ ہی گیا
ہوں تو گھر والوں میں سے بھی کسی کو دیکھتا چلوں۔

دروازے میں کچھ کھڑ بڑ سنائی دی۔ کوئی جالی کا اسپرنگ لگا دروازہ کھولنے اور کرسی نکالنے کی بہ یک وقت کوشش میں سخت ناکام نظر آرہا تھا میں شرافت سے نظریں نیچی کیے بیٹھا رہا۔ پھر وہ کرسی ٹیڑھی بانکی دروازے میں پھنسی چھوڑ دی گئی اور آواز آئی "آپ یہ کرسی لے لیجئے، گھر میں کوئی نوکر نہیں ہے۔"

"جی نہیں شکریہ، میں بڑے آرام سے ہوں" جب شام رات میں بدل رہی ہو، شفق کی سرخی پھیلی ہو۔ گملوں میں لگی اور ستونوں پر چڑھی بیلیں ہوا میں ہل رہی ہوں اور ان میں بسیرا لینے آنے والی چڑیاں چوں چوں کر رہی ہوں تو زمین پر بیٹھنا واقعی اچھا لگتا ہے اور پھر کسی نادیدہ چہرے والی کو خواہ مخواہ چھیڑنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ ذرا جل کر کچھ کہے یا غصے میں پاکستانی پکچر کی ہیروئن کی طرح باہر نکل پڑے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر پھنکارے "اے مسٹر!!" — مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اندھیرے میں بیٹھا رہا اور کرسی وہاں اسی طرح شکنجے میں پھنسی پڑی رہی۔

کچھ دیر میں تاریکی گہری ہو گئی۔ گھر کے اندر اکا دکا بتیاں جلیں مگر میں اسی طرح اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ شاید اس انتظار میں کہ کوئی آن کر برآمدے کی لائٹ جلائے اور میں اسے دیکھ سکوں — مگر کوئی نہیں آیا۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ اس عمر میں قسمت آزمائی یوں بھی اچھی لگتی ہے۔ سڑک پر اکا دکا کاروں کے گزرنے کی آواز آتی رہی۔ دور کسی گھر میں ریڈیو پر میرا پسندیدہ نغمہ بج رہا تھا۔ دور سے آتی ہوئی اس کی آواز بھلی لگ رہی تھی۔ دور سے پسندیدہ نغموں کی آواز اور زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً جب شام رات میں بدل رہی ہو اور آپ کسی انجانے گھر کی سیڑھیوں پر کسی انتظار میں بیٹھے ہوں۔ کس انتظار میں یہ آپ کو خود بھی معلوم نہ ہو۔

یکایک آس پاس کے سارے گھروں اور سڑکوں کی بتیاں ایک دم بجھ گئیں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ میں نے سوچا اب چلا جائے۔ پچھایا جھاڑتا کھڑا ہوا تو

اسی وقت ہاتھ میں موم بتی لیے کوئی آیا اور دروازے میں الجھی ہوئی کرسی سے الجھنے لگا۔ میں نے ادھر دیکھا۔ وہ نازک سی خوش شکل سی ایک لڑکی تھی۔ موم بتی کی کانپتی لو کی روشنی اور سائے میں وہ پُراسرار چینی کہانی سی لگ رہی تھی۔ ایسی کہانی جس میں خوبصورت مُردہ لڑکیوں کی روحیں خوب صورت انسانی قالب میں ڈھل کر رات کے اندھیرے میں اکیلے مردوں کو چھیڑنے آیا کرتی ہیں۔

میں نے دوڑ کر اس کی مدد کی اور کرسی نکال کر باہر رکھ دی۔ وہ دروازے میں اسی پُراسرار روح کی طرح کھڑی رہی۔ ہلکی روشنی میں ہلکے گہرے سائے اس کے چہرے پر دوڑ رہے تھے اور قمیص کے گریبان میں ٹکے ہوئے آئینے موم بتی کی روشنی میں کہیں کہیں سے ہنس رہے تھے۔

"باہر تو بہت اندھیرا ہے۔ آپ چاہیں تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ جائیے — مگر اندر روشنی نہیں ہے۔"

"تعجب ہے آپ کے ہوتے ہوئے روشنی نہیں ہے۔" بعض دفعہ گھسے پٹے فقرے بھی کتنے نئے اور خوبصورت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میرے اس گھسے پٹے فقرے نے بھی اپنا کام کیا۔ زیرِ لب مسکراہٹ ہلکی سی روشنی میں اُبھری اور آنکھوں میں چراغ کی لو سی لہرائی۔ اسی وقت بھق سے سارے گھروں اور سڑکوں کی بتیاں جل اٹھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر برآمدے کی لائٹ آن کر دی۔

وہ یقیناً نازک خوش شکل اور جاذبِ زیب سی لڑکی تھی۔ متوسط قد، کھلے ہوئے بال جو اس کے چہرے کے تیکھے خدوخال کو نمایاں کر رہے تھے۔ بجلی کی روشنی میں چینی کہانی کی پُراسراریت غائب ہو گئی تھی۔ لیکن یہ بات کتنی غنیمت تھی کہ وہ موم بتی کی روشنی ہی میں نہیں بجلی کی روشنی میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔

"اب چلوں گا۔" میں نے کہا۔

اتنی دیر انتظار کیا ہے تو......"

"بس انتظار کی مدت ختم ہو گئی"

"جی ـــــ" وہ میرے رمز کو سمجھی نہیں یا بن گئی۔

"میں نے سوچا تھا اگر وہ ساڑھے سات تک نہ آیا تو میں چلا جاؤں گا" گھڑی دیکھتے ہوئے یہ فقرہ میں نے فی البدیہہ کہا۔ امجد آئے تو بتا دیجئے کہ جنید آیا تھا"

"جی اچھا"

موم بتی بجھاتی وہ اندر چلی گئی اور میں اپنے گھر کی طرف چلا مگر قدم کچھ رُک رُک کر اٹھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بظاہر تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ امجد اپنے دوستوں کو اپنے گھر آنے سے روکے۔ آجکل تو جوان بہنوں والے بھائی خواہ مخواہ بھی دوستوں کو اپنے گھروں میں گھسیٹا کرتے ہیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ اشتہار انگلیوں سے چھُوا جو امجد کو دکھانے لایا تھا۔

کیوں نہ یہ اشتہار دیتا چلوں؟

کل وہ تمہارے ہاں ضرور پہنچے گا۔

ہاں ـــــ مگر ابھی دے دیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس عمر میں اگر کوئی کسی کو دوسری نظر دیکھنے کو یوں بے تاب ہو تو کوئی ایسی بری بات بھی تو نہیں۔

گیٹ ابھی تک کھُلا ہُوا تھا میں اندر چلا گیا۔ برآمدے کی روشنی پھر بند تھی۔ مجھے ذرا سا تعجب ہُوا۔ بڑے کفایت شعار لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ پھر یکایک نظر اٹھی۔ چھوٹے سے احاطے میں دو سائے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے۔ دونوں کی پیٹھ اس طرف تھی۔ ایک تو وہی معلوم ہوتی تھی۔ وہی قد، ویسا ہی جسم، وہی بال۔ دوسرا سایہ مردانہ تھا۔ لمبا کوٹ، چغہ یا گاؤن پہنے ہوئے۔ یہ کون ہو سکتا ہے ابھی تو اس گھر میں کوئی نہیں تھا۔ یہ کون آیا اور کہاں سے آیا!!! ـــــ برآمدے کی بتی بند

— ہاتھ میں ہاتھ .... پوری طرح کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے — اس سے پہلے کہ وہ دیوار تک پہنچ کر پلیٹیں میں دبے پاؤں مگر پھرتی سے گیٹ سے نکلا اور اپنے راستے پر پڑ لیا۔

آج کل کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ اس لیے میں نے چند دن سے پینٹنگ شروع کر دی تھی۔ رنگ مجھے ہمیشہ سے لبھاتے تھے۔ پینٹنگ کرنے اور آرٹ کے بارے میں کتابیں پڑھنے میں بہت سا وقت گزر جاتا تھا۔ دوسرے دن آس پاس رنگ بکھیرے جب میں اپنے خیال میں ایک تجریدی شاہکار تخلیق کر رہا تھا تو مجھے ایک عجیب خیال آیا کہ اگر کوئی آدمی ایک بہت خوبصورت سی پینٹنگ پہلی نظر میں دیکھ کر پسند کرے اور اسے خریدنے پر آمادہ ہو جائے اور اس وقت پتہ چلے کہ وہ پینٹنگ تو پہلے ہی بک چکی ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا — اسے دھکا سا لگے گا — اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے وہ پینٹنگ پہلے سے کہیں زیادہ حسین معلوم ہونے لگے اور وہ اسے ہر صورت میں حاصل کرنا چاہے۔ لیکن پینٹنگ کا اپنا دل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ خود کسی پینٹنگ کو کسی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھ لیں تو آپ کو اس بات پر راضی برضا ہونا چاہیئے کہ جب اس پینٹنگ نے اپنا مالک چن لیا ہے تو..... مگر یہ تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ وہ مالک کون ہے! پینٹنگ نے اسے کیسے چُنا۔ وہ اسے خریدنے کی دسترس بھی رکھتا ہے یا صرف رات کے اندھیرے میں اسے دیکھنے ہی آیا کرتا ہے۔ خدا کا شکر کہ اسی وقت امجد آپہنچا۔ میں نے اس سے کہا۔

"یار کل شام میں تمہارے ہاں گیا تھا بہت دیر گھنٹی بجائی۔...."

"ہاں کل ہم سب ایرپورٹ گئے تھے۔ صرف جمال بھائی گھر پر تھے۔ وہ رات کی ڈیوٹی کے بعد دن بھر سوتے ہیں اور کوئی انہیں کسی قیمت پر اٹھا نہیں سکتا۔"

جمال بھائی کا ذکر اس نے پہلے بھی کیا تھا۔ وہ اس کے بہنوئی تھے۔ یوں ذکر تو

سب ہی بھائی بہنوں کا آنا رہتا ہے مگر میں ان میں سے کسی سے بھی صورت آشنا نہیں تھا۔

"ہاں، بہت دیر بعد کوئی ..... غالباً تمہاری بہن .... مگر کیا تمہاری فرخندہ باجی اتنی دبلی پتلی ہیں ؟"

"نہیں ــــ وہ تو خوب پلی پلائی ہیں ــــ وہ نائلہ ہو گی ــــ آجکل اس کے امتحان ہو رہے ہیں وہ نیچے رہ گئی تھی ــــ اس کا کمرہ اوپر کی منزل پر ہے اور وہ ہے بھی خاصی ڈرپوک ــــ سمجھی ہو گی شاید کوئی چور، ڈاکو گھنٹی بجا کر لوٹنے آیا ہے۔ اتنے اتنے سے دل ہیں ہمارے گھر والوں کے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس پر فخر کیا جاتا ہے۔"

میرے ذہن میں گاؤن پہنے ایک بڑا سا سایہ ابھرا اور ڈوب گیا۔

امجد میرے شاہکار کو دیکھنے کے بجائے بکھرے ہوئے رنگوں، خالی ڈبے بوتلوں رنگ سے بھرے چیتھڑوں کو بڑے غور بلکہ حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

"یار تم بڑے خوش قسمت ہو" وہ یہ جملہ اکثر کہا کرتا تھا۔ اور جب میں وجہ پوچھتا تو ٹال جاتا یا کوئی ایسی وجہ بتاتا جو بعد میں سوچی گئی ہوتی۔

"کیوں ؟" میں نے ہمیشہ کی طرح پوچھا۔

"اب پینٹنگ ہی کر لیتے ہو ــــ میں تو بڑا بور ہوتا ہوں۔"

"تو تم بھی شروع کر دو۔"

"نہیں میرے بس کا نہیں اور ہمارے گھر میں ان چیزوں کی اجازت بھی نہیں۔"

"کیا مطلب ؟"

"کچھ نہیں، اب چلوں گا۔ فاخرہ کو وقت دے رکھا ہے۔"

"تمہارے گھر میں لڑکیوں کو وقت دینے کی اجازت ہے ؟"

"ارے نہیں، کیوں دکھتی رگ کو چھیڑتے ہو۔ اب چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

وہ چلا گیا ــــ نہ اس نے پوچھا کل میرے گھر کیوں آئے تھے، نہ میں نے بتایا۔

تھے جن پہ محنت تو بہت کی گئی مگر ان کو جتنا اصلی دکھانے کی کوشش کی جائے اتنے ہی نقلی نظر آتے ہیں۔ وہ قطعی فلیٹ تھے۔ یعنی ان میں تیسری بُعد کی سخت کمی تھی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا: "تم کس کمرے میں رہتے ہو، مجھے اپنے کمرے کی شکل تو دکھاؤ۔"

وہ بولا "ارے یار ۔ میرا کمرہ کہاں ہے۔ ہم دو بھائی اکٹھے رہتے ہیں۔ اسے کسی ہسپتال کا پرائیویٹ وارڈ سمجھو — ہر چیز قرینے سے ہونی چاہیئے۔ چادریں صاف، میز پوش صاف، کتابیں جگہ پر — کوئی چیز کسی مصرف کی نہیں ہے صرف اپنی جگہ پر سجانے کے لیے ہے — کچھ مزا نہیں آتا یار ایسی جگہ پہ رہنے کا۔ اسی لیے تو میں تمہیں وہاں نہیں لے جاتا — مجھے شرم آتی ہے۔"

یہ الٹی منطق تھی۔ عموماً لڑکوں کو اپنے بے ہنگم میلے کمروں میں لے جاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے مگر اسے صفائی ستھرائی سے الرجی تھی۔

ایک دن وہ میرے ہاں آیا تو میں بخار میں پڑا تھا، اکیلا اپنے کمرے میں — پلنگ کے پاس تپائی پہ دوائیں اور پانی کا گلاس رکھا تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی اور شاید بے حد خوشی بھی جیسے گھر والوں نے مجھے تنہا ڈال کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہو۔ بڑے بشاش لہجے میں بولا: "یار تم کتنے خوش قسمت ہو۔"

"کیسے؟"

"مزے سے اکیلے پڑے ہو۔ ہمارے ہاں کوئی بیمار پڑ جائے تو اس قدر ہائے ہائے مچتی ہے کہ پوچھو نہیں۔ کوئی نہ کوئی سر پہ سوار رہے گا۔ مجال ہے مریض کو ایک منٹ کو سکون مل جائے۔ ہر شخص خاطر مدارات میں لگا رہے گا۔ اس کے علاوہ پورے خاندان میں فوراً بیماری کی اطلاع پہنچائی جائے گی۔ جو شخص عیادت کے لیے نہ آئے اس سے سدا کے لیے رشتے ناطے توڑنے کی دھمکی دی جائے گی۔ چاہے معمولی

اور اس کے بعد میں اکثر اس کے ہاں جانے لگا مگر وہ پھر کبھی مجھے تنہا نہ ملی۔ اس کو دیکھ کر جب کبھی دل دھڑکنے کی کوشش کرتا تو دو سائے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ذہن میں ابھرتے اور مجھے کچھ عجیب سا خلجان محسوس ہوتا جیسے کوئی بہت اچھی بات یاد آتے آتے رہ گئی ہو۔

اور جب میں اکثر اس کے ہاں جانے لگا تب ہی اس بات کا انکشاف ہُوا کہ وہ کیوں دوستوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ وہ اپنے گھر والوں کو ددد سمجھتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ دوست یہ بات جانیں۔

وہ میرے ہاں آتا تو دندناتا ہُوا میرے کمرے میں چلا آتا۔ میں ان کے گھر جاتا تو مجھے تکلّف سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا اور مجھے کبھی اس سے آگے کی دہلیز پار کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ کوئی جا کر امجد کو اطلاع دیتا۔ امجد آتا تو اس کی یہی کوشش ہوتی کہ مجھے ساتھ لے کر کہیں باہر چلا جائے۔ اگر میں ٹالتا تو مجبوراً بیٹھا رہتا۔ تکلّف سے چائے آتی۔ اس دوران اگر کوئی رشتے دار یا کسی اور بہن بھائی کا دوست آجاتا تو اسے بھی یہیں بٹھایا جاتا۔ تکلّف کی فضا قائم رہتی۔ گھر والے اطمینان سے آتے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے۔ یہ باور کرنا تو مشکل تھا کہ وہ ہمیشہ ہی "لانڈری شفاف" رہتے ہوں گے۔ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ مہمانوں کی آمد پر فوری کپڑے تبدیل کرتے ہوں۔

مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارے ہاں آگ دھیمے دھیمے جلتی ہے۔ ان کے ہاں بھڑ بھڑ کر کے۔ یہاں کوئی لب گر ہوتا تو پتہ نہ چلتا۔ وہاں کسی کو چھینک آتی تو کہرام مچ جاتا۔ یہاں کوئی برسوں بعد آتا تو ماں یونہی برائے نام گلے لگاتی۔ وہاں ہر گھڑی گلے میں بانہیں اور پیار کے پھول نچھاور ہوتے۔ مجھے تو یہ سب کچھ عجیب لگتا ہی تھا مگر تعجب یہ ہوتا تھا کہ امجد کو جو اسی ماحول میں پیدا ہو کر جوان ہُوا ہے یہ کیوں عجیب لگتا ہے۔ بلکہ مجھے تو اس کے گھر والے کسی اناڑی مصوّر کے بنائے ہوئے ایسے پورٹریٹ لگتے

زکام ہی کیوں نہ ہو مگر آنے جانے والوں سے مریض کا ذکر یوں ہو گا جیسے وہ اب چلا کہ چلا ۔۔۔ یار عجب "فسی فیملی" ہے ہماری بھی۔ ایک دن مکان کا نام تجویز ہو رہا تھا بڑے بڑے رومانی نام لیے جا رہے تھے۔ میں نے کہا اس گھر کا نام ہونا چاہیئے "فسی ہاؤس"۔ تو لے کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور جانتے ہو میرے اس درجہ بگڑ جانے کی وجہ کیا ہے ؟"

"کیا ؟"

"تم اور کون ۔۔۔ کہا جاتا ہے کہ اُجڈ دوستوں میں اٹھ بیٹھ کر امجد غریب نازک احساسات و جذبات سے کورا ہو گیا ہے اور بہت جلد انسان سے ڈھگا بن جائیگا ۔۔۔ یار تھوڑی سی جگہ تو دو ۔۔۔" وہ میرے پائنتی ٹھس کر بیٹھ گیا۔ آج وہ بڑی ترنگ میں تھا۔ کہنے لگا ۔۔۔ "یار تم نہیں جانتے اس گھر کی ہر روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے۔ ہماری نانی اماں کو دیکھو، دھیلہ بھر پیار نہیں کرتیں ہم لوگوں کو۔ مگر جب کوئی آئے گا تو ایک ایک کو بلائیں گی کہ صبح سے دیکھا نہیں۔ آنکھیں ترس رہی ہیں اور جناب سینے سے لگائیں گی، بلائیں لیں گی، پیار کریں گی اور حکم دیں گی کہ سامنے بیٹھے رہو کہ دل بھر کے دیکھ لوں ۔۔۔ یار اتنی ہنسی آتی ہے ان کی بناوٹ پر مگر حیرت ہے کہ جیسے سب کچھ سمجھتے ہی نہیں چپ چاپ ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں، میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ ہاں اور دوسروں کے سامنے جو ماں بیٹیوں اور بہنوں بہنوں میں پیار و محبت کی باتیں ہوتی ہیں تو ہنسی روکنا دو بھر ہو جاتا ہے۔ جب میں اٹھ کر بھاگتا ہوں تو مجھے اُجڈ، گنوار اور اکل کھرا کہا جاتا ہے ۔۔۔ دوسروں کے ہاں دیکھتا ہوں۔ مثلاً اب تمہارے ہاں ڈیموکریسی ہے مگر ہمارے ہاں ڈکٹیٹرشپ ہے اور ڈکٹیٹرشپ بھی ایک آدمی کی نہیں ایک خود ساختہ نظام کی۔ یوں سمجھو کہ ہمارے ہاں جمہوریت نے بھی ڈکٹیٹرشپ کا روپ دھار لیا ہے۔ کچھ باتیں طے ہیں کہ ان کو گھر کا کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مثلاً گھر کے کسی بھی فرد سے ملنے آنے والا ڈرائنگ روم میں بیٹھے گا۔ کسی کے سامنے بھی آپس کے اختلافات کا ذکر کسی صورت نہیں کیا جائے گا بلکہ دوسروں کے سامنے باہمی اور دائمی محبت کا ایسا ڈھونگ رچایا جائے گا کہ لوگ اس خاندان کی محبت اور مروّت پر عش عش کریں گے اگر کوئی ذرا سا بھی بیمار ہو تو ایسے میں گھر کے کسی فرد کو کسی پکچر، پکنک یا پارٹی پر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ مگر وہ ظاہر یہ کرے گا کہ فلاں شخص کی بیماری کی وجہ سے اس کا اپنا دل قطعی کسی تفریح پر آمادہ نہیں۔ جو ایسا نہیں کرے گا سب اس کو نکّو بنائیں گے جیسا کہ مجھے اکثر بنایا جاتا ہے۔ میں ہی اس گھر کی ایک "کالی بھیڑ" ہوں۔"

"مگر یہ سب کیوں ہے؟ میں مارے تجسّس کے بخار ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا آج وہ موڈ میں ہے، ذرا پتا تو چلے۔

"یار اس فسی فیملی کی ہسٹری بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے بڑی تحقیق کی ہے اس پر اور ایک ایک شخصیت کا تجزیہ کیا ہے۔ ہمارے نانا کی ہماری نانی سے کہیں دُور کی رشتے داری تھی۔ ہماری نانی ہوا کرتی تھیں بڑی حسین و جمیل۔ وہ تو تم اب بھی انہیں اور امّی کو دیکھ کر اور اس فقیر کے حُسنِ بے مثال کا اندازہ کر کے سمجھ سکتے ہو۔ قصہ مختصر ہمارے نانا کا ان پر دل آگیا اور کہا کہ شادی کروں گا تو یہیں ورنہ کچھ کھا کر سو رہوں گا سنتے ہو! وہی انیسویں صدی والا عشق بلا خیز۔ چنانچہ جب رشتہ طے پا گیا تو ہمارے پرنانا نے بڑے نخرے دکھائے! پاندان کا خرچ الگ بندھوایا۔ اس سمے زمانے میں ایک لاکھ مہر، گھر دامادی اور جانے کیا کیا کچھ — ہمارے نانا نے ہر بات منظور کی۔ چنانچہ اس دن سے اس خاندان کو ایسا احساسِ برتری ہوا کہ بچّے بچّے کے پر لگ گئے۔ انہوں نے خود کو دنیا بھر سے اونچا سمجھنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے ہمارے ابا بھی شروع ہی سے ان کے قابو میں آگئے اور زندگی بھر امّی ہی کے نہیں

ساری سسرال کے بے دام غلام رہے۔ جہاں چاہا بٹھایا، جب چاہا اُٹھایا۔ اور اب تو ان کی وہ حالت ہو گئی ہے، اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے کہ رہائی ملے گی تو بھی مر جائیں گے کئی دفعہ ابا سے بات کرنی چاہتا ہوں اس سلسلے میں، مگر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو گئی ہے یعنی انہیں صحیح معنوں میں برین واش کر دیا گیا ہے اور وہ ان باتوں کو ٹھیک ہی سمجھتے ہیں جو اس گھر میں سدا سے ہوتی آئی ہیں۔ یاد ہے تم نے ایک مرتبہ پوچھا تھا کہ تمہارے ہاں صرف فرخندہ باجی کی اب تک شادی ہوئی ہے باقی بہن بھائی اب تک کنوارے کیوں ہیں؟ ارے بھائی کوڑھ مغز! ـــ اتنے دن سے ہمارے ہاں آ جا رہے ہو اتنی سی بات نہیں سمجھے کہ ہمارے جوڑے ملیں گے کہاں؟" ـــ اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا جیسے وہ تمسخر میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ارے ہم سا خوبصورت، قابل، کلچرڈ گھرانا کوئی اور ہو تو وہاں جوڑ ڈھونڈنے جائیں نا ـــ ابھی تک تو اللہ میاں نے صرف ایک ہی پرفیکٹ فیملی بنائی ہے" ـــ وہ ہنستا ہنستا دہرا ہو گیا ـــ مگر یار ـــ اس سلسلے میں بھی ان لوگوں کو وہ دھکا پہنچانے والا ہوں جس سے شاید ہی کوئی جاں بر ہو" وہ میرے گلاس کا بچا کھچا پانی غٹاغٹ پی گیا اور گلاس کو زور سے میز پر پٹک کر بولا:

"میں فاخرہ سے شادی کر رہا ہوں۔"

"فاخرہ!" ـــ مجھے واقعی تعجب ہوا کیونکہ وہ ہر طرح اس گھرانے کے لیے ایک پیروڈی تھی۔ کالی موٹی، دھم دھم چلنے والی۔ چپڑ چپڑ چیونگم کھاتے ہوئے زور زور سے بولنے والی منہ پھٹ لڑکی۔ پہلے تو میں مذاق ہی سمجھا مگر امجد نے مجھے یقین دلایا کہ وہ بالکل سنجیدہ ہے۔ اس نے تو جیسے اس گھرانے کے ہر مان کو توڑنے کا عزم کر رکھا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ جب سب سے پہلے اس نے فاخرہ کو دیکھا تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ لڑکیاں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔ پڑھی لکھی تو اس کی اپنی بہنیں بھی کم نہ تھیں۔ پردہ بھی نہیں کرتی تھیں مگر وہ انہیں پردے کی بوبوئیں ہی کہا کرتا تھا — اور کبھی — بنتے والی چابی کی گڑیاں — مجھے اس کی یہ بات ناپسند تھی کیونکہ — مجھے ایک ایسی ہی لڑکی اچھی لگتی تھی۔

"اچھا یار چلتا ہوں — فاخرہ کو وقت دے رکھا ہے — مزے سے اکیلے پڑے رہو اور یاد رکھو اگر اب کے کبھی میں بیمار پڑوں تو میرے حال پر رحم کھا کے مجھے اپنے گھر لے آنا۔"

وہ بھدر بھدر سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔

چند دن بعد اسے نوکری کا پروانہ ملا، مگر بیرونِ ملک — وہ بتاتا گھر والے کس قدر فس (F U S S) مچائے ہیں جیسے وہ چاند پر جا رہا ہو۔ امّی کو دن رات غشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ انہیں ایسی نوکری نہیں چاہیئے جو اِن کے لاڈ کے پالوں کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دے وغیرہ۔

جتنا گھر والے زور دیتے کہ وہ اس نوکری پر نہ جائے۔ اتنا ہی اس کا ارادہ پختہ ہوتا جاتا۔ گھر والوں کی شدت پسندی نے اسے بھی انتہا پسند بنا دیا تھا۔ ادھر وہ نہ صرف فاخرہ سے شادی کا پختہ عزم کیے بیٹھا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے اس سے نکاح کر لے تاکہ غیر ملک میں جب وہ جم جائے تب آسانی سے فاخرہ کو بلا سکے اور اس وقت اس کے گھر والوں کو اس شادی کی اطلاع ہو۔ فاخرہ کی امّی اس شادی کے لیے تیار تھیں مگر امجد کے گھر والوں سے وہ بھی ڈرتی تھیں۔ چنانچہ امجد کا خیال تھا کہ یہ نکاح ہمارے گھر پر ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے یہ بات امّی سے کی تو وہ بگڑ گئیں۔

"میرے آگے بھی لڑکیاں ہیں۔ کل کو شازیہ، نازیہ بھی کسی کے گھر جا کے نکاح

پڑھوا آئیں گی تو میں کیا کروں گی۔"

معاملہ بے ڈھب تھا۔ امجد کا اصرار تھا کہ وہ خود امی سے بات کریگا میں نے کہا چلو ٹھیک ہے۔ نمٹ لیں وہ آپس میں دونوں کو۔

بڑی زوردار بحث ہوئی۔ امجد کا کہنا تھا کہ اس کے گھر والوں کو قیامت تک وہ لڑکی پسند نہیں آئے گی جو اس کی پسند پہ پوری اترے گی اور وہ ہر گز ہر گز اس لڑکی سے شادی نہیں کرے گا جو اس کے گھر والوں کے معیار پہ پوری اُترےگی

آخر امی نے کہا کہ وہ خود اس کے گھر جاکر گھر والوں کو فاخرہ سے شادی کرنے پر راضی کرلیں گی۔ اس پہ وہ ہاتھ جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہُوا اور بولا:

"یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گا ___ میں اس خاندان کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر آپ وہاں میری وکالت کرنے گئیں تو وہاں آپ کی اتنی توہین ہوگی کہ میں برداشت نہیں کر سکوں گا ___ آپ نہیں جانتیں وہ بے حد بے رحم لوگ ہیں۔ خود شیشے کے گھر میں رہتے ہیں لیکن دوسروں پہ پتھر پھینکنے سے باز نہیں آتے۔ کیا آپ یہ پسند کریں گی کہ آپ کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی جائیں۔" اس نے امی کو بے حد زِچ کیا۔ آخر میں امی نے فیصلہ سنا دیا کہ پہلے وہ گھر والوں سے فاخرہ کا ذکر کرے، انہیں اپنے ارادے کی پختگی کا احساس دلائے اور دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔

ہُوا یہی جب اس نے فاخرہ سے شادی کا خیال ظاہر کیا تو گھر میں ایک طوفان اٹھا۔ وہ آن کر بتاتا کہ گھر میں اس کا بائیکاٹ ہو رہا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ ناہنجار ہے، نافرمان ہے، بڑے بھائیوں کے ہوتے ہوئے اپنی شادی کی فکر میں پڑا ہے۔ امی سے وہ کہتا:

"خالہ جان بڑا مزا آرہا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھونچال آگیا ہے

یا کوئی بم پھٹ گیا ہے۔ سارا گھر گتّے کے مکان کی طرح لرز رہا ہے..... فاخرہ سے شادی!!! — اتنی بد شکل لڑکی سے — ایسی لڑکی سے جس کا گھرانہ ابھی کل تک کرچین تھا معمولی لوگ — ان کے ہاں برات لے کر جانا بھی کسرِ شان ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اس طوفان کی لہریں باہر بالکل نہیں جا رہیں۔ باہر سے کوئی آئے تو اسے ذرّہ بھر بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ ابھی سارا گھر لٹھ لیے میرے اوپر پلا کھڑا تھا — اور وہ ٹھیک کہتا تھا کیونکہ جب کبھی میں جاتا اس کا گھر قطعی نارمل نظر آتا۔ اس کی شادی کی کوئی بات میرے سامنے نہ کی جاتی۔ تنہائی میں وہ مجھ سے کہتا:

"سنتے ہو کہا جاتا ہے کہ بُرے لڑکوں کی صحبت نے مجھے اس قدر آوارہ بنا دیا ہے کہ اپنے منہ سے شادی کی بات کر رہا ہوں ورنہ بڑے لڑکے لڑکیاں تو اس قدر معصوم ہیں کہ اس لفظ کے معنی تک نہیں جانتے۔ یار عجیب سٹنٹ ہے، کئی دفعہ میں نے امّی کو کہتے سنا، میرے بچے اس قدر بھولے ہیں کہ اس قسم کی باتوں کو سمجھتے ہی نہیں بس خدا قسم دل چاہا کہوں امّی کون بھولا ہے اور کس قسم کی بات نہیں سمجھتا، یہاں تو سب کے پیٹوں میں ڈاڑھیاں ہیں — مگر ہوتا کیا — ایک دم کائیں کائیں میرے خلاف مچ جاتی اور پیٹوں میں ڈاڑھیوں والے واقعی معصوم بن جاتے۔"

روز کی یہ رام کہانی سن کر آخر امّی کا دل پسیج گیا اور انہوں نے یہ اجازت دے دی کہ امجد کا نکاح ہمارے گھر ہو جائے مگر اس کے باہر جانے کے صرف ایک دن پہلے۔

جس دن نکاح تھا اپنی اپنی جگہ ہم سب گھبرائے ہوئے تھے۔ امّی کو اپنے سفید چونڈے کا خیال تھا مجھے یہ کہ میری وجہ سے یہ سب کچھ میرے گھر میں ہو رہا ہے اور سب سے زیادہ بدلا ہوا تھا امجد۔ وہ بے حد ملگجے کپڑے پہنے صبح سے ہمارے ہاں چلا آیا تھا اور نکاح ہو جانے سے پہلے کسی طرح گھر جانے کو آمادہ نہیں تھا۔ جب کہ نکاح شام کو ہونا طے پایا تھا۔ تنہا فیصلہ کرنے والوں پر ایک وقت آتا ہے، جب وہ سوچتے

ہیں کہ کہیں انہوں نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا۔

دوپہر کو وہ منہ لپیٹے میرے بستر پر پڑا رہا۔ اس کے گھر والے یہی سمجھتے رہے ہوں گے کہ باہر جانے سے پہلے کے ہزاروں کام نمٹا رہا ہے۔ سہ پہر کو میں نے زبردستی اسے بستر سے نکالا اور کپڑے بدلنے کی تاکید کی۔ تیار ہوتے وقت بھی اس کا دماغ سخت غیر حاضر تھا۔ جو موزہ اتارتا اسے ہی دوبارہ چڑھا لیتا۔ قمیص کے بٹن کھولنے میں اسے گھنٹوں لگے اور پھر وہ بغیر قمیص اتارے اسٹول پر بیٹھ گیا اور مجھ سے بولا۔

"جنید — ایک بات کہوں ؟"

"فرماؤ۔" میں نے مذاقاً کہا مگر دیکھا تو اس کے چہرے پر ضرورت سے زیادہ ہی سنجیدگی تھی۔ کیا یہ آخری وقت میں نکاح سے بیک آؤٹ ہونا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا۔

"تم میرے سب سے عزیز دوست ہو۔ میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ گے ؟"

"میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا ..... " میں نے بات کو پھر مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔

"تم نائلہ کو پسند کرتے ہو ؟"

اب میری سنجیدہ ہونے کی باری تھی اور میں یک لخت سنجیدہ ہو گیا — جب بھائی بہن کے بارے میں کسی سے ایسا سوال کرے تو معاملہ گھمبیر ہو جاتا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا اور کہا "ہاں۔"

"کیا تم اس سے شادی کرنا چاہو گے ؟"

"میں خاموش رہا۔ اس پہلے دن کے بعد نائلہ پھر کبھی مجھے تنہا نہیں ملی تھی اور روز بروز مجھے یہ اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ بڑا مشکل گھرانہ ہے۔ ان کے گھر کی کسی لڑکی کی تمنا کرنا

مشتری و ثریا پہ ہاتھ ڈالنے کے برابر ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میں کبھی کبھی اس آگ میں ہاتھ تاپنے سے باز نہ آتا جو دور تھی مگر جس کی آنچ کبھی کبھار مجھ تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ جب سامنے ہوتی میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا۔ پکچر کا پروگرام بنتا تو میں اسے ساتھ چلنے کی پیش کش کرتا جو ہمیشہ ٹھکرا دی جاتی۔ وہ چائے کی پیالی دیتی تو بڑے تکلف سے کھڑے ہو کر لیتا اور اخلاق سے صوفے کی طرف اشارہ کر کے کہتا "بیٹھئے" — مگر وہ مسکراتی ہوئی چلی جاتی — شاید یہ سب امجد بغور دیکھتا رہا ہوگا — لیکن وہ پہلی رات کا مردانہ سایہ ابھی تک میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا — مجھے خاموش دیکھ کر امجد پریشان ہو گیا۔ "فارگٹ اِٹ —" اس نے کہا اور راز سر تو قمیص کے بٹن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا — "امجد! تم نے صاف گوئی سے کام لیا ہے تو مجھے بھی کیا اس کی اجازت دوگے — ؟ میرے دل میں ایک کانٹا سا کھٹک رہا ہے ......" اور میں نے اس رات کی وہ سائے والی بات اسے بتادی۔

وہ خاموش رہا۔ کچھ سوچتا رہا، جیسے کسی کشمکش میں ہو۔ پھر کہنے لگا: "یہ ہمارا خاندانی راز تھا — تمہیں اس کا کچھ اشارہ مل گیا ہے مگر میں نہ ملوث کرو اس میں نہیں ہونے دوں گا۔ سنو، میں تمہیں بتاتا ہوں، تم نے میری دوسری بہن سائرہ کو دیکھا ہے؟"

اس وقت تک میں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ کبھی آکر ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھی تھی لیکن آتے جاتے اس کی جھلک نظر آتی تھی — یہی بات میں نے امجد کو بتادی۔

"اس دن تم نے جسے دیکھا وہ سائرہ ہوگی۔"

"مگر تمہاری جس بہن کی شادی ہوئی ہے ان کا نام تو . . . ."

"ہاں یہی تو بتا رہا ہوں — وہ فرخندہ باجی ہیں — مگر ہمارے بہنوئی صاحب کچھ اچھے کردار کے مالک نہیں ہیں اور سائرہ — بہت دن ہوتے کہ ہر طرح کے

اخلاقی بندھن توڑ چکی ہے ـــــ جب وہ انگلینڈ میں تھی تو اس نے ایک غیر ملکی سے شادی کی اور پھر اسے بھی چھوڑ کر چلی آئی۔ وہ کہتی ہے کہ وہ فری لو کی قائل ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم نے اس دن جسے دیکھا وہ سائرہ تھی ـــــ کیونکہ وہ ہمارے ساتھ کہیں نہیں جاتی۔ اس کے آنے جانے اور کھانے پینے، ہر کام کے اوقات الگ ہیں۔ نوکری کرنے کی وجہ سے وہ یوں بھی زیادہ وقت باہر ہی رہتی ہے۔ اس دن وہ کہیں گئی ہوئی تھی یا گھر میں تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں مگر یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ وہ نائلہ نہیں ہوگی۔ اس دن تم نے جو دو سائے دیکھے۔ ان میں ایک ہمارے بہنوئی کا کردار تھا اور دوسرا فری لو کا تصور ـــــ سائرہ کے بگڑنے میں اس گھر کے ماحول کا کتنا ہاتھ ہے۔ یہ الگ بات ہے۔ میں تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ اس سب کو ہمارے گھر میں برداشت کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ کسی پر بھی سختی کی گئی تو بات باہر نکل جائیگی دنیا میں تھڑی تھڑی ہو جائے گی۔ گندگی کو ڈھانپ کر رکھنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک دن تو اس کی بو نکلے گی ہی اور دور دور تک پھیلے گی۔ ممکن ہے یہ راز جاننا تمہارے حق میں بہتر ہو کیونکہ اس رازداری کے ناطے وہ تمہیں اپنوں میں ملانا چاہیں گے تاکہ تم بھی یہ بات کسی اور کو نہ بتا سکو مگر میں چاہتا ہوں کہ تم ہر طرح یہ اطمینان کر لو کہ وہ نائلہ نہیں تھی۔"

"ٹھیک ہے اگر تم کہتے ہو تو مجھے یقین ہے۔" اتنی دیر میں سائرہ اور نائلہ کی ظاہری ہیئت کی یکسانی اور ان کی شخصیتوں کے فرق پر غور کر کے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ امجد غلط نہیں کہہ رہا۔

"دونوں میری بہنیں ہیں اور مجھے کسی سے پرخاش نہیں ہے۔ نائلہ پر ابھی تک گھر انہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ جلد اس جیل خانے سے نکل جائے ورنہ اسے بھی غلط تصورات، غلط آئیڈیل دے کر گمراہ کر دیا جائے گا لیکن یہ اسی صورت میں

ہونا چاہیئے کہ تم نائلہ کو واقعی پسند کرتے ہو ــــ اس معاملے میں صاف گوئی ضروری ہے ۔ بی فرینک ود می ــــ کیا تم سچ مچ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے پھر اپنے دل سے پوچھا اور کہا "ہاں"۔

"باوجود ان تمام باتوں کے جو میں نے تمہیں بتائی ہیں ؟"

"یعنی ؟"

"یعنی ــــ یہ کہ ہمارا گھر ایک وادیٔ پُرخار ہے جو باہر سے جیسا پُرسکون نظر آتا ہے اندر سے ویسا نہیں ہے ۔ قدم قدم پر اختلافات ہیں، کدورتیں ہیں، رنجشیں ہیں یہ صفائی ستھرائی جو تمہیں نظر آتی ہے صرف اوپری ہے ۔ یہ وکٹورین مارلز جن کا ذکر تم نے ہمارے ڈرائنگ روم میں اکثر سنا ہوگا محض دکھاوا ہے ۔ جیسے وکٹورین عہد کے لوگ صرف اوپری شرافت کے قائل تھے اور حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کئے رکھتے تھے ــــ اگر تم نائلہ سے شادی کرو تو میں تمہیں رائے دوں گا کہ تم اس شہر سے دُور کہیں رہو اور نائلہ کو کم سے کم اس گھر میں آنے کی اجازت دو۔"

"مگر اس میں صرف میری ہی پسند تو نہیں اوروں کی پسند اور ان کی مرضی بھی تو ہو گی ــــ خود نائلہ کی ــــ تمہارے والدین کی ــــ اور دوسروں کی ــــ" میں نے کہا۔

"وہ تو ہوگی ہی ــــ اور بھی بہت کچھ ہوگا ــــ" وہ آئینے کے سامنے ٹائی باندھتے ہوئے بولا ــــ مگر تمہیں بہت فرم رہنا ہو گا ۔ یاد رکھنا میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تمہیں گائیڈ بھی کروں گا ۔ ایک دفعہ شادی کی بات طے ہو جائے تو پھر تم سخت ہو سکتے ہو ــــ تم ہم لوگوں کی کوئی شرط نہیں مانو گے ۔ ہمارے ہاں گھر دامادی کا جو یہ سلسلہ چل نکلا ہے تمہیں اس کو بھی توڑنا ہے اور ہماری اُنا کو بھی ۔ سمجھے ۔ یہ بہت ضروری ہے ــــ لیکن یہ سب ابھی نہیں ہو سکتا ــــ قلعہ میں پہلی دراڑ تو مجھے ہی ڈالنی ہے ــــ سمجھو کہ آج قلعہ کے محاصرے کا پہلا دن ہے ۔ جس دن

میری شادی کا اعلان ہوگا اس دن قلعہ میں دراڑ پڑے گی — " رفتہ رفتہ اس کا موڈ بہتر ہو گیا۔

"دیکھو جب فاخرہ میرے پاس پہنچ جائے گی تو میں اس کی اور اپنی ایک مشترکہ تصویر نہیں بھیجوں گا۔ اس وقت تم میرے گھر جا کر اس شادی کا اعلان کرنا اور تماشہ دیکھنا۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ امّی نے بتایا کہ فاخرہ اور اس کی امی آگئی ہیں بظاہر وہ دونوں ملاقات کے لیے آئی تھیں۔ فاخرہ بالکل سادہ کپڑوں میں تھی۔ آج وہ بھی پھٹے بانس کی طرح ہنسنے کے بجائے سوکھی تُرئی کا سا مُنہ لیے پھر رہی تھی — تھوڑی دیر کے بعد ہمارے دو مشترکہ دوست مولوی صاحب کو لے کر آ گئے اور یہ رسم بڑی سادگی سے ادا ہو گئی۔ امّی نے چائے میں تھوڑا سا تکلّف کیا۔ جلد ہی فاخرہ اور اس کی امّی رخصت ہوئیں۔ مولوی صاحب اور دوست سدھارے اور پھر امجد بھی اپنے گھر چلا گیا۔

قلعے کا محاصرہ تو ہو گیا تھا مگر مجھے قلعہ میں پہلا شگاف ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ امجد نے یہی کہا تھا کہ اپنی شادی کا طوفان گزر جانے کے بعد وہ یہ معاملہ اٹھائیگا۔

دوسرے دن ایرپورٹ پر میں جان بوجھ کر امّی کو لے گیا۔ فاخرہ بھی آئی ہوئی تھی، امجد کے دوسرے دوست بھی، مگر امجد کے گھر والوں نے کسی کو پلٹ کر نہ دیکھا — انہیں اپنے چونچلوں سے اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔ سب امجد پر جان نچھاور کر رہے تھے۔ بلائیں لیتے لیتے اس کی نانی کی انگلیاں ٹوٹی جا رہی تھیں۔ ماں اور خالاؤں نے اس کا ماتھا چوم چوم کر سُرخ کر دیا تھا بہنیں الگ گلے کا ہار بنی ہوئی تھیں۔ اس کے دونوں بازوؤں پر یہاں سے وہاں تک بندھے ہوئے امام ضامن کسی مزار پر لگے ہوئے رنگین جھنڈوں کا سماں پیش کر رہے تھے۔

ایسے ڈھنگ سے اپنے دوستوں کو خدا حافظ کہنے کا وقت بھی نہ ملا اور فاخرہ

سے تو شاید آنکھوں آنکھوں ہی میں گفت گو ہوئی۔ ہم سے رخصت ہو کر جہاز تک پہنچتے پہنچتے اس کے گھر والوں میں سے اکثر کو غشی کے دورے پڑ چکے تھے کئی ایک کو طبی امداد پہنچائی گئی۔ جس وقت جہاز اڑا۔ سب دل پکڑے نڈھال پڑے تھے۔ بمشکل سب کو کاروں تک پہنچایا گیا۔ دیکھنے والوں کو بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ پورا کنبہ اب امجد کی جدائی کی تاب نہ لا کر سیدھا قبرستان کا رُخ کرے گا۔

میں چاہتا تھا امی ایک نظر نائلہ کو دیکھ لیں مگر شروع میں ان کی رُکھائی اور بعد میں اس ٹریجک سین نے اس کی اجازت نہ دی ــــ گھر آن کر جو پہلی بات امی نے کی وہ یہ تھی:

"خدا بچائے ایسے نخرے پیٹے لوگوں سے ــ امجد ٹھیک کہتا تھا۔ مگر میں تو کہوں گی اس نے اچھا نہیں کیا ــ فاخرہ کبھی ایسے گھر میں خوش نہیں رہ سکتی"

مجھے محسوس ہُوا کہ جیسے قلعے کا محاصرہ کمزور پڑ رہا ہو۔

امجد چلا گیا تو میں نے اس کے گھر جانے کے بہت سے بہانے سوچے مگر کوئی بھی دل کو نہ ٹھکا۔ یا میں اتنا بزدل تھا کہ امجد کی غیر حاضری میں اس واڈی پر خار میں جانے سے گھبراتا تھا۔ بار بار یاد آتا اس نے کہا تھا وہ بہت بے رحم لوگ ہیں خود شیشے کے گھروں میں رہتے ہیں مگر دوسروں پر پتھر پھینکنے سے باز نہیں آتے ــ پھر میں نے وہاں جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اگر میری شادی نائلہ سے نہ ہو سکی جس کا امکان بہت کم تھا تو میں اس کی جدائی میں مر تو نہ جاؤں گا۔ میں مرا تو قطعی نہیں مگر کبھی کبھی دل میں ایک کسک سی ضرور اٹھتی اور یوں بھی ہوتا کہ میں خود کو عین اس حالت میں پکڑ لیتا جب غیر شعوری طور پر کسی بہانے وہاں جانے کا منصوبہ بنا رہا ہوتا۔

کبھی کبھی میں فاخرہ کے ہاں چلا جاتا اور کبھی بھولے بھٹکے وہ بھی ٹپک پڑتی

معلوم ہوتا امجد کے خط برابر اس کے پاس آرہے ہیں۔ وہ ہر طرح ہشاش بشاش ہے اور جلد ہی اسے بلانے والا ہے۔ میرے پاس بھی اس کے خط آتے جن میں وہ برابر اطلاع دیتا کہ اتنی دور سے بھی اس کی فاخرہ سے شادی کی درخواست بڑی بیدردی سے ٹھکرائی جارہی ہے اور گھر والوں میں کسی قسم کی کوئی لچک پیدا ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔

ادھر میں ایک اور کٹھن دور سے گزر رہا تھا۔ جب آنکھ کھول کر آپ نے چاروں طرف آپا دھاپی دیکھی ہو جب آپ کے بزرگ بھی ساری پرانی قدریں بالائے طاق رکھ کر کاراور کوٹھیوں کی راہ پر چل نکلے ہوں اور نفسِ امّارہ کو مارنے کے بجائے دولت کے جن کو رام کرنے کا مشورہ دینے لگے ہوں۔ جب تعلیم کا مقصد محض نوکری ہو اور ہر بچہ اچھی سی نوکری کو زندگی کی معراج سمجھتا ہو۔ اس وقت چار سال انجینئرنگ کالج میں جھک مارنے اور سفارشوں سے پریس میں ایک معمولی سی ملازمت ملے سے جس کا آپ کی تعلیم سے کوئی واسطہ نہ ہو تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی ؟ —— اور جب آپ کے ذہن پر یہ بوجھ بھی ہو کہ آپ کو جہاں رشتہ کرنا ہے وہ آپ سے زیادہ امیر لوگ ہیں اور جہاں ظاہری معیار خواہ شرافت ہی کیوں نہ ہو اصل معیار وہی ہے جو ہر جگہ ہے —— اور پھر آپ کے کندھوں پر اس گھرانے کی روایات توڑنے اور ان کی اَنا کو کچلنے کا بھاری کام بھی ہو —— بڑی ہمت سے میں اپنے کندھے سیدھے کرتا اور کہتا —— دنیا میں دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ زندگی کی اعلیٰ قدریں بھی تو ہیں مثلاً —— سچائی —— ایمان داری —— سمپل لونگ اینڈ ہائی تھنکنگ وغیرہ وغیرہ۔ مگر فقر دل کے غنا کا نام ہے۔ فقر کی منزلیں بے کاری کے ہاتھوں طے نہیں ہوتیں —— ایسی بے کاری جس کے ساتھ رنجِ رائیگاں اور دولت کے زیاں کا احساس ہو، جس کے ساتھ دوستوں، رشتہ داروں اور پڑوسیوں کی دل جلانے والی

ہمدردیاں ہوں، صرف احساسِ کمتری ہی دے سکتا ہے۔ چنانچہ میں بھی احساسِ کمتری کا شکار ہوتا گیا۔ ایک صبح جاکر جب رات گئے ایک ایسے کام سے واپس آتا، جس میں میرا دل قطعی نہیں لگتا تھا تو مجھے اپنے جسم کے ساتھ ذہن بھی کچلا ہوا محسوس ہوتا ــــ لیونارڈو ڈونچی اور مائیکل اینجلو دیواروں پر سے میرے اوپر ہنستے، مانے، مونے اور پکاسو کی نقلیں گرد کے پردے میں سے میرا منہ چڑاتی نظر آتیں۔

اس احساسِ کمتری کے ہاتھوں امجد کے ہاں جانا اور بھی دوبھر ہو گیا اور میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح ملک سے باہر جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔

آخر ایک دن امجد نے فاخرہ کو بلوا بھیجا۔ فاخرہ کے جانے کے سلسلے میں جو بہت سے کام تھے۔ ان میں بھی میں نے مدد کی۔ ان کے جانے کے کوئی پندرہ دن بعد امجد کا خط اور دونوں کی تصویر آئی۔ اس میں ایک چھوٹا سا خط اس کی امّی کے نام تھا جس میں اس نے اپنی شادی کی اطلاع دی تھی۔ انہیں یہی تاثر دیا تھا کہ شادی پردیس میں ہوئی ہے ـــ امجد کا اصرار تھا کہ یہ خط میں خود لے کر جاؤں۔ میں گیا۔ ایسی خبر لے کر جانے پر میں قدرتی طور پر گھبرایا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ خبر سب سے پہلے کس کو اور کیسے سناؤں۔ دل ہی دل میں مختلف منصوبے بناتا اور انہیں رد کرتا میں امجد کے ہاں پہنچا۔ ایسے موقعوں پر ایک ذرا سی بات پر سارے منصوبے دھرے رہ جاتے ہیں۔ میری بدقسمتی کہ اسی وقت کوئی بزرگ رشتے دار اٹھ کر جا رہے تھے اور گھر کے بہت سے لوگ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب کو تعجب سا ہوا ـــ اب چونکہ امجد نہیں تھا اور اس کے جانے کے بعد میں پہلی مرتبہ آیا تھا تو شاید انہیں کچھ تجسس بھی تھا یا ہو سکتا ہے کہ ان کے حسّاس ذہنوں نے میرے چہرے کے تاثر سے کچھ تاڑ لیا

ہوا ان کے چہرے پر خاموش تجسّس تھا۔ ادھر گھبراہٹ میں میرے منہ سے وہی بات نکلی جو میں نہیں کہنا چاہتا تھا۔ یعنی میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ شاید غیر شعوری طور پر میں اپنے آنے کی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا ــــ چنانچہ وہ سب میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئے ــــ صرف امجد کے والد اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ جو ابھی آیا تھا باتیں کرتے اندر چلے گئے۔

صوفوں پر بیٹھنے کے بعد جب کسی نے کوئی بات شروع نہ کی جیسے وہ مجھ ہی سے کچھ سننا چاہتے ہوں تو جھجکتے ہوئے میں نے کہا:

"امجد کا خط آیا ہے ــــ اس نے لکھا ہے کہ میں ــــ آپ لوگوں کو اطلاع دے دوں کہ اس نے فاخرہ سے شادی کر لی ہے"۔

اور یہ کہتے کہتے ثبوت کے طور پر میں نے امجد کا خط اور تصویر بڑھائی ــــ تصویر کو کس کس نے دیکھا مجھے نہیں معلوم، لیکن میرے ہاتھ سے کسی نے نہیں لی ــــ بس ایک دم ایک کہرام سا مچا، جیسے واقعی زلزلہ آ گیا ہو ــــ کچھ چیاؤں چیاؤں ہوئی ــــ کچھ سسکیاں کچھ سبکیاں سنائی دیں۔ یک لخت کچھ عجیب سی چیخیں ــــ لمحہ بھر میں امجد کی امی قالین پر پڑی تھیں ــــ اور چاروں طرف آہ و بکا اور نالوں کی سی آوازیں گونج رہی تھیں ــــ ایک دم بھگدڑ سی مچی ــــ کوئی چلّایا ــــ پانی ــــ کوئی پکارا ــــ عرق گلاب ــــ کسی نے کہا ــــ ڈاکٹر ــــ کسی نے کہا ــــ ٹیلی فون ــــ کچھ لوگ باہر بھاگے ــــ کچھ امجد کی امی پر جھکے رہے ــــ یکایک میں نے امجد کی نانی کو ننگے پاؤں ننگے سر باہر کی طرف بھاگتے دیکھا۔ وہ بین کرنے کے انداز میں چلّا رہی تھیں ــــ ہائے آخر میری بیٹی کو مار ڈالا اس لڑکے نے ــــ ختم ہو گئی ــــ مجھے معلوم تھا یہی ہو گا ــــ ہائے کیا بُری خبر لے کر منحوس صورت گھر میں گھسا تھا خدا اس سے سمجھے"۔

آخری جملہ میری شان میں کہا گیا تھا ــــ میں سُن ہو گیا ــــ

پھر کچھ اور بھگدڑ مچی ــــ سب ایک دوسرے کمرے کی طرف بھاگنے لگے ــ پھر کسی نے ڈاکٹر کو فون کرنے کی کوشش کی۔ ایک بھائی بھاگتا ہُوا باہر گیا۔ اس نے کار نکالی۔ اس وقت میں بھی ہوش میں آیا۔ بغیر کچھ کہے سنے اٹھا۔ بھاگتا ہُوا دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ گیا۔

جب تک ہم ڈاکٹر کو لے کر آئے مجھے اصل قصہ معلوم نہیں تھا۔

ڈاکٹر کو سیدھا ایک بیڈروم میں لے جایا گیا۔ میں صحن میں کھڑا رہ گیا۔ بہت سے لوگ ایک دوسرے سے چمٹے کھڑے رو رہے تھے۔ کوئی ستون سے لگا رو رہا تھا۔ کوئی پیشانی کوٹ رہا تھا۔ کوئی سینے پر دو ہتھڑ مار رہا تھا۔ کچھ عجیب عالم تھا سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب ہوتی جا رہی تھیں۔

جس وقت ڈاکٹر سر ہلاتا ہُوا باہر نکلا اور ایک دم شور و شیون پہلے سے زیادہ ہُوا جس میں ہائے ابّا ــــ ہائے ابّا کی صدائیں بلند تر تھیں تو یکایک مجھ پر انکشاف ہوا کہ امجد کے والد کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے ــــ

مجھے اپنے اوپر بے حد غصہ آیا۔ مجھے محسوس ہُوا جیسے میں خونی اور قاتل ہوں ــــ اور ان رونے والوں میں کوئی میرا گلا دبا دے تو قطعی غلط نہ ہو گا ــــ ایک نظر میں نے نائلہ پر ڈالی جو غم سے بے حال بستر پر اوندھی پڑی تھی ــــ اپنے آپ کو اس روح فرسا احساسِ جرم سے بچانے کے لیے میں چپکے سے باہر نکلا۔

لوگ جوق در جوق اسی گھر کی طرف آ رہے تھے ۔ محلے دار اور رشتے دار ــــ چند لوگ ٹولیوں میں باہر کھڑے تھے ۔ ایک جگہ میں نے مرحوم کے اس بھتیجے کو کھڑے دیکھا جو آخری وقت میں ان کے پاس تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بیٹے کی شادی کی خبر تو ان بیچارے کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ انہوں نے تو صرف اتنا سنا کہ بیوی ختم ہو گئی۔ رونا، چلّانا اور چیخنا پیٹنا تو ہو ہی رہا تھا انہیں یقین

آگیا اور وہ جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی دل پکڑ کر گر پڑے — ان کے گرنے کی خبر سنتے ہی بیوی جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئیں — مگر وہ ختم ہو چکے تھے۔"

"ہائے ہائے — اس عمر میں بھی ایسا عشق تھا بیوی سے — اس کے بعد جینے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے"۔ یہ صاحب غالباً مرحوم کے رشتے کے بھائی تھے۔

والد کے انتقال کی اطلاع میں نے امجد کو دی۔ امجد اور فاخرہ آئے مگر ان کو اس گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں ملی۔ بیس دن وہ اپنی سسرال میں رہا مگر اس کی ماں اور نانی جن کے دل چڑیا کے تھے ذرا نہ پگھلیں۔ بہن بھائی جن کے جگرے کبوتر کے تھے کوئی اسے دیکھنے نہ آیا اور جتنی مرتبہ بھی وہ تنہا یا فاخرہ کے ساتھ گھر گیا اسے گھر کے دروازے بند ملے اور نوکر سے ایک ہی جواب :

"آپ کو اندر آنے کی اجازت نہیں۔"

جس دن وہ واپس گیا۔ جہاز پر اسے اور فاخرہ کو چھوڑنے صرف میں تھا اور فاخرہ کی امّی — فسی (F U S S Y) فیملی میں سے کوئی وہاں نہ تھا — اور آج تک اس گھرانے میں امجد کا شمار باپ کے قاتلوں میں ہے حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ امجد کی شادی کی خبر واقعی ان کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی۔

امجد کے بعد کوئی بھی تو نہیں جو انہیں یہ بتائے کہ انہیں امجد نے نہیں آپ لوگوں کے بے انتہا "فس" نے مارا ہے۔

قلعہ میں شگاف کیا پڑا۔ سارا قلعہ ہی اڑاڑا دھم کر کے زمین پر آرہا — جس کے نیچے امجد اور فاخرہ تو دبے ہی میری تمام آرزوئیں بھی کچلی گئیں۔ میں ہی تو وہ سبز قدم تھا جس نے قلعے کے بارودی فلیتے کو آگ لگائی تھی۔

آشیاں گم کردہ

اس نے اپنے گھر کی سفید مغلئی محراب سے سر ٹکا دیا اور اندھیرے میں افسردگی سے مسکرائی۔ قدرت حسِ مزاح سے خالی نہیں ہے۔ کبھی کبھی کیسے خوبصورت مذاق کرتی ہے۔ اب مثلاً زمان کے بیٹے کا رشتہ اس کی بیٹی کے لیے آنا ایک خوبصورت مذاق ہی تو ہے ـــ اس زمان کا بیٹا، جس نے اس کی بہن گُل افروز کی زیادتی کا بدلہ خود اس سے لیا۔ اگر گُل افروز نے اس کے بھائی کا دل توڑا تھا تو وہ خود تو ذمہ دار نہیں تھی مگر اس کے بعد زمان نے خود اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی قسم کھا لی کیونکہ وہ پٹھان تھا۔ غیرت اور حمیت سے مجبور ہو کر بدلہ لینا ان کی سرشت میں شامل ہے کس تلخی سے اس نے کہا تھا:

"اپنی بہن سے کہہ دینا محبت میں چوائس نہیں ہوتی، محبت اپنا چناؤ خود کرتی ہے۔"

اور جب اس نے یہ بات گُل افروز سے کہی تھی تو وہ ہنس کر ٹال گئی تھی۔ اس

کا کہنا تھا کہ شہزور کے ساتھ وہ قطعی سیریس نہیں تھی۔ نہ ان کے درمیان وعدے وعید ہوئے تھے۔ یوں باتیں اور پھولوں کا لین دین کزنوں کے درمیان ہوا ہی کرتا ہے مگر اس کے اور زمان کے درمیان تو یہ بھی نہ ہوا تھا۔ پھر بھی وہ جنم جنم نرگس کے اس پھول کا انتظار کرتی رہی جو اسے کبھی نہیں ملا — زمان نے ٹھیک ہی تو کہا تھا:

"محبت میں چوائس نہیں ہوتی۔"

دور کونے میں ہلکے سبز رنگ کی ٹھنڈی روشنیاں یوں جگمگا رہی تھیں جیسے بہت سی حسین لڑکیاں جھرمٹ میں کھڑی ہنس رہی ہوں۔ نیچے سڑک پر بادام، ہارسنگھار اور گل مہر کے درختوں کی پرچھائیوں کا اتنا حسین جال سڑک پہ بنا ہوا تھا کہ گھنٹوں بیٹھے رہو تو جی نہ بھرے۔ ٹھنڈی سمندری ہوا کپڑوں کے ساتھ دل بھی اڑائے لیے جا رہی تھی تو کیا وہ ہاں کر لے مگر کیا نرگس کے ساتھ زیادتی نہ ہو گی۔ کیا یہ چکر سدا یوں ہی چلتا رہے گا؟ نرگس جو کراچی کے اس بے موسمی موسم کی عادی ہے۔ بیاہ کر اس جگہ جائے جہاں ہر موسم ٹوٹ کر آتا ہے۔ جہاں سردی آتی ہے تو درختوں پر جھاڑ و پھر جاتی ہے اور ٹھنڈی یخ ہوائیں کلیجہ چیرتی ہوئی گزرتی ہیں۔ جہاں ٹھنڈے دنوں میں دل کے دل سیاہ بادل امنڈتے ہیں اور کبھی چھلنی سے چھنتی پھوار کی طرح اور کبھی سفید پتھروں کی شکل میں اولے بن کر گرتے ہیں۔ وہ ننگ منگ درخت، پیروں میں روندتے گیلے سرخ اور زرد سوکھے پتے، سخت جان یوکلپٹس کے درخت، زرد سرخ پڑتی برآمدے کی بیلیں، جلتی انگیٹھیاں، موٹے موٹے لحاف اور حسب توفیق خشک میوے۔ ان سب خوبصورتیوں کا لطف وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس کا بچپن اس علاقے میں گزرا ہو اور پھر بہار کی ہوا، جھاڑ و پھرے درختوں کو کیسے ایک دم سے ہرا کر دیتی ہے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب وہ منی منی گٹھلیاں کھل کر ہرے بھرے پتے بن کر لوٹے درختوں پر چھا گئیں۔

پھر آتی گرمیوں کی سہانی بارشیں جو دھوپ کی شدت اور چڑھتی گرمی کی تیزی کو کم

کرتی جاتیں۔ اس بارش میں برآمدے کی بیلوں کے اور شیشم کے درختوں کے تازہ پتّے کیسے نکھر جاتے۔ رخصت طلب کرتے نرگس کے پیلے پنڈرخ پتّوں میں بھی جان سی پڑ جاتی۔ چڑیاں بے تحاشا چہچہاتیں اور رنگ برنگے پھولوں کا رنگ کیسے اُجل جاتا شہتوت کا پیلا پیلا بُور اس بارش میں جھڑ جاتا مگر گھٹون کے گلابی مائل پھولوں کی خوشبو اتنی تیز ہو جاتی کہ ان کے نزدیک سے گزرتے ہی کھٹ سے دماغ میں چڑھ جاتی۔ یوکلپٹس کے چھوٹے چھوٹے پیلے پیلے برش جیسے پھول جھولتی شاخوں پر چمک اٹھتے اور ان درختوں کے سفید تنے دھل کر یوں کھل جاتے جیسے سوئمنگ پول سے نکل کر آنے والی کسی مغربی سندری کی ٹانگیں۔ مگر کیا نرگس یہ سب کچھ یوں محسوس کریگی اس کے دل میں تو نرگس کے پھولوں کی ذرا بھی چاہت نہیں ہے۔ اس کو تو اپنا نام بھی پسند نہیں ہے۔ "امّی! آپ نے میرا نام نرگس کیوں رکھا ہے، مجھے یہ نام بالکل پسند نہیں ہے۔" ایک دن بیٹھے بٹھائے اس نے کہا تھا۔

"بیٹی، یہ ایک بے حد خوبصورت . . . . اور پیارے پھول کا نام ہے کاش تم نے نرگس کا پھول دیکھا ہوتا۔"

اسے دُکھ ہو رہا تھا۔ اس کی بیٹی ہو کر وہ نرگس کے پھولوں سے پیار نہیں کر سکتی اس کی خوب صورتی کو سمجھ نہیں سکتی۔ نرگس کے پھولوں کی بھینی مہک اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے۔ ماں اور بیٹی میں اتنا بُعد! . . . پھر وہ کچھ سوچ کر دُکھ سے مسکرا دی۔ ہاں اس کی ماں میں اور اس میں بھی تو اتنی ہی دوری تھی۔

ہر خالق کو شوق ہوتا ہے کہ مخلوق کو اپنی شکل میں ڈھالے مگر مخلوق کو بھی ضد ہوتی ہے کہ وہ اس شکل میں نہ ڈھلے جس میں خالق اسے ڈھال رہا ہے۔ اسے بھی تو اپنی انفرادیت اور انا عزیز ہوتی ہے۔ شاید ابد تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی شکل میں ڈھالا تو کیا وہ ڈھل گیا۔ وہ تو اور ہی رنگ اختیار کرتا چلا گیا۔ اپنی اَنا کے پھریرے اڑاتا شیطان کے پرچم تلے جا پہنچا۔ خود بھی شرمسار ہُوا اور خالق کو بھی شرمسار کیا۔ ابھی چند روز ہوئے اس نے پڑھا تھا۔ ناول کا ایک کردار کہہ رہا تھا:

"خدا نے جس وقت دنیا کی اسٹڈی بنائی وہ بگڑ گئی جس طرح بعض اوقات بڑے بڑے مصوّروں کی اسٹڈیز بگڑ جاتی ہیں تو پھر کچھ چارۂ کار نہیں رہتا سوائے اس کے کہ انہیں دوبارہ بنایا جائے۔ شاید اللہ میاں بھی اس دنیا کو ازسرِ نو بنانے پہ غور کر رہا ہو۔"

یہی خالق سے بغاوت کی بات تو ان کی کئی پشتوں میں ہوتی چلی آ رہی تھی۔ نانی سو فیصد پٹھان تھیں نجیب الطرفین، لانبی، صحت مند اور سرخ و سپید، زبان کی تیز اور دل کی کھری۔ اپنے سے بھی تیز زبان اور دل کے کھرے پٹھان سے بیاہی گئیں اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر دی۔ اس ارمان میں کہ بیٹی کو بھی کوئی ایسا ہی کھرا آدمی مل جائے مگر بیٹی، اس کے سامنے دونوں ماں باپ مل کر یہ غضب ڈھا چکے تھے کہ اس زمانے میں اسے کالج میں پڑھایا جب پٹھانوں میں لڑکیوں کو پرائمری تک پڑھانا بھی آسان کام نہ تھا۔ اب خاندان میں اس افلاطون سے شادی کون کرتا۔ ہمت کر کے کوئی یہ ہاتھی گلے باندھ بھی لیتا مگر اب اس پڑھی لکھی لڑکی کے خیالات یہ ہو چکے تھے کہ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی پٹھانوں کے دقیانوسی، سو فیصد مردانہ سماجی ڈھانچے میں خوش نہیں رہ سکتی۔ اس نے صاف کہا کہ میں اپنی ماؤں کی سی محبت میں یقین نہیں رکھتی جہاں مرد کی ہر اچھی بُری عادت سے پیار کیا جائے۔ ایسا پیار جیسا پالتو جانور اپنے مالک سے کرتے ہیں کہ جس وقت بھی آیا اس کے جوتے چاٹنے شروع کر دیے۔ اس نے جب چاہا گود میں لے لیا، اپنے بستر میں سُلا لیا اور جب چاہا ٹھوکر سے پرے دھتکار نکالا

بڑھ چلا گیا۔ پڑھی لکھی لڑکی کو جیون ساتھی چاہیئے نہ پوجا کے لیے لمبا چوڑا خوبصورت اپالو کا مجسمہ، نہ رات کے لیے کوئی گلگو

اور یوں انہوں نے خاندان بھر سے بغاوت کر کے ایک غیر پٹھان سے شادی کی۔ ماں باپ بھی مجبوراً مان گئے۔ انہیں خدشہ ہو گیا تھا کہ اب یہ بھاری پتھر یوں آسانی سے سر سے اُترے گا بھی نہیں۔ یوں شادی کے بعد اپنے خیال میں وہ بہت ترقی پسند بنتی گئیں۔ پردے کو خیرباد کہا۔ بچوں کے نام پٹھان ناموں سے مختلف رکھنیں اور ان سے اردو یا انگریزی میں بات کرتیں اور اب کہنے کو وہ پٹھان نہیں تھی کہ یہاں رشتے باپ سے چلتے ہیں۔ وہ باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ ان کی ہر ادا اُسے پسند تھی۔ پھر بھی دیکھنے میں وہ بالکل پٹھان تھی۔ وہی رنگ روپ، سفید جیسے کچا ناریل، گلابی جیسے گلاب کی کلی، قد جیسے کھیتوں کی حدبندی پر اُگا ہوا سفیدا۔ اس کی خالاؤں کی شادیاں رشتے ہی میں ہوئی تھیں۔ وہ اپنی خالہ اور ماموں زاد بہن بھائیوں میں گھل مل کر رہتی۔ فر فر پشتو بولتی اور کسی کو لمحہ بھر کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ ابا غیر پٹھان تھے مگر رہے ساری عمر اسی علاقے میں۔ اس نے یہیں آنکھ کھولی۔ ننگے سخت چٹیل پہاڑ، کھردرے علاقے کے کھردرے لوگ اسے پسند تھے۔ اسے یہاں کے چھوٹے چھوٹے قلعہ نما گھر بہت اچھے لگتے تھے۔ چاہے دو کمروں کا کچا مکان ہی کیوں نہ ہو مگر اس میں بھی پھاٹک ہوتی تھی، حفاظت کا معیار، پٹھان کی غیرت کا نشان!

گورے چٹے، لمبے لمبے بالوں والے ہنستے کھیلتے لڑکے، گول بال ماتھے پر، ڈالے سیب کی طرح سرخ، فاختاؤں کی طرح معصوم آنکھوں والی لڑکیاں، لحیم شحیم اکھڑ آواز و اور سخت اصولوں والی مائیں اور گھر کی دنیا سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود گھر کی دنیا میں رلے ملے رائفلوں اور حجروں کے درمیان زندگیاں گزارنے والے باپ ــــ یہ سب

اسے پسند تھا۔ اونچی اونچی دیواروں والے گھر، چقیں پڑی کھڑکیاں اور برآمدے، زنانے مردانے مکان، عورتوں کی الگ دنیا، ان کے مشغلے، ان کی رِیتیں رسمیں، مردوں کے شکار کے ہنگامے، لڑائیاں، دعوتیں اور پکنکیں، سب ہی کچھ اسے اچھا لگتا تھا۔ مگر امّی یہ انتظار کیے بغیر کہ پٹھانوں کے رشتے ان کے ہاں آتے بھی ہیں یا نہیں بانگِ دہل اعلان کر چکی تھیں کہ وہ اپنی لڑکیوں کی شادیاں پٹھانوں میں کرنے کا ارادہ نہیں رکھتیں کراچی میں ان کے میاں کے بھائیوں کا ایک سے ایک اسمارٹ لڑکا پڑا ہُوا تھا۔ جن کے بڑے بڑے بزنس تھے جن کے لیے یورپ گھر کا آنگن تھا اور جو بیویوں کی قدر کرنا جانتے تھے۔

اب نامعلوم امّی کے نزدیک بیویوں کی قدر کرنے کا مطلب یہی تھا کہ ان کے لیے ایک بڑا سا گھر ڈیفنس سوسائٹی میں، دو کاریں گیراج میں اور سینکڑوں ساڑیاں وارڈروب میں موجود ہوں اور اس کے بعد وہ یورپ کے نائٹ کلبوں میں جو چاہے کرتے پھریں اور اب اس کا کیا علاج کہ کراچی کے مرنجاں مرنج طبیعت والے موسم کی طرح اسے مرنجاں مرنج طبیعتیں بھی بالکل پسند نہیں تھیں۔ اس کا شوہر نہ کسی بات کا اقرار کرتا نہ انکار۔ اگر کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تب بھی صاف صاف انکار نہ کرتا۔ صرف ٹالے جاتا۔ نامعلوم یہ کراچی کے موسم کا اثر تھا یا اس کی تجارتی ذہنیت کہ وہ ہر ایک کو خوش کرنا چاہتا۔ اس کے کوئی اصول نہیں تھے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے پر قادر تھا۔ وہ کوئی کام اپنی خوشی سے کرتا تو بھی یوں جیسے اس میں کسی جذبے کو دخل نہ ہو، اگر ہو گیا تو ٹھیک ہے، اگر نہ ہُوا تو بھی کوئی بات نہیں اور اس بے دلی میں قناعت نہیں بے حسی تھی۔ تپاک نہیں تجارتی سوجھ بوجھ تھی۔ کہاں وہ پٹھانوں کی ذرا سی بات میں پہاڑوں کی طرح اٹل ہو جانے والی شخصیت۔ آندھی آئے، طوفان آئے مگر وہ اپنی جگہ قائم۔ غلط یا صحیح، جان دے کر بھی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر نرم ہیں تو پہاڑوں سا

کی برف کی طرح ڈھیرے ڈھیرے پگھل رہے ہیں مگر بظاہر اپنی سختی برقرار اپنی شان قائم ہے۔

کراچی کے اس مرنجاں مرنج موسم میں وہ اس سخت، تند پٹھان مزاج موسم کو بھی ترس گئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جس طرح نرگس کا پھول کراچی کی رتیلی نیم گرم اور تر فضا میں پرورش نہیں پا سکتا۔ اسی طرح اس جیسی پٹھان صفت لڑکیاں بھی یہاں پنپ نہیں سکتیں۔

"مگر میرا نام ایسے پھول پر رکھنے کی کیا ضرورت تھی جو میں نے آج تک نہیں دیکھا مجھے تو یہ پرانی داستانوں کی کنیزوں کا نام معلوم ہوتا ہے۔"

"تم نے نرگس کا پھول نہیں دیکھا تو آج دیکھ لو اب تو کراچی میں بھی نرگس کے پھول بکنے لگے ہیں۔" اس کے باپ نے کہا تھا۔

"سچ! کہاں؟ —" کس قدر تڑپ کر اس نے پوچھا تھا کہ اس کا شوہر گاڑی چلاتے چلاتے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"بلس اینڈ کمپنی" کے پتھریلے پرانی وضع کے برآمدے میں بیسیوں رنگ برنگے ولایتی پھولوں کے ساتھ نرگس کے پھول بھی موجود تھے۔ کیسے لپک کر اس نے نرگس کے پھول تھامے، انہیں ناک سے لگا کر، آنکھیں بند کر کے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ یکایک ایسا لگا جیسے وہ اپنے چھتوں والے مکان میں پہنچ گئی ہو۔ جہاں سامنے لان میں نرگس کے لمبے ڈنٹھلوں والے ہرے ہرے پودے سینکڑوں کی تعداد میں قطار اندر قطار لگے تھے۔ اس دن کے بعد سے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ وہ نرگس کے موسم میں الفنی سے گزری ہو اور اس نے نرگس کے پھول نہ لیے ہوں۔ ان پھولوں کو عبادت کی حد تک انہماک اور خوبصورتی سے وہ گلدانوں میں لگاتی، لمبے سبز ڈنٹھل بڑی نفاست سے اپنی جگہ جمے رہتے۔ اس کے سفید پھول جن کے درمیان زرد رنگ کا بڑا اساداڑہ شاعروں کو آنکھوں کا تصور دیتا ہے، کمرے میں بھینی بھینی مہک بھر دیتے۔ اسے یہ بات بڑی اچھی لگتی تھی کہ

نرگس کے پھول بہت دن تک پانی میں سرسبز رہتے اور یوں آہستہ آہستہ مرجھاتے،
جیسے کوئی امیر اور خوبصورت عورت بوڑھی ہوتی ہے۔ ان کی خوشبو اسے بیتے دنوں کا ایک
عجیب خوشبو بھرا احساس دلاتی تھی۔ جب بھی وہ نرگس کے پھول خریدتی اسے زمان ضرور
یاد آتا۔ بعض غیر متعلقہ چیزوں میں کیسے انوکھے اور اٹوٹ رشتے قائم ہو جاتے ہیں۔
پھولوں اور خوشبوؤں کی تو یہ خصوصیت ہے کہ ادھر ناک کے پاس لاؤ اُدھر کھٹ
سے ذہن میں ماضی کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔

اور وہ تو خوبصورت پھولوں اور خوشبوؤں کا دیس تھا۔ کیسی کیسی حسین جگہیں وہاں
تھیں۔ جہاں ہوا میں خوشبوؤں کے ساتھ نشہ بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جبھی تو اس دن
دریا کے کنارے گول پتھروں پر کھڑے کھڑے وہ یکایک جھوم کر ایسی لہرائی کہ گرتے
گرتے بچی۔ پاس کھڑے ہوئے زمان نے اسے تھاما اور چھوڑ دیا مگر اس کے بعد سارا
دن اس کا دل لہراتا، جھومتا گرتا ابھرتا رہا۔

اسے یاد نہیں کہ کون سی تاریخ تھی مگر اس رات کا شبِ ماہتاب ہونا طے تھا اور
وہ سب لوگ رات گئے کالام میں لکڑی کے کیبنوں کے باہر چاند کے انتظار میں سحر زدہ
سے بیٹھے تھے۔ ہر طرف بادلوں کی یورش تھی اور پہاڑ ویسے بھی اتنے اونچے تھے کہ چاند
ان کی بلندیاں سر کیے بغیر نظر نہ آسکتا تھا۔ ہوا اتنی لطیف اور خنک تھی کہ بڑے لوگ اس
کی تاب نہ لاکر کمروں میں دبک گئے تھے اور حسبِ عادت کافی پینے اور باتیں کرنے میں
مصروف تھے۔ اچانک کسی کو خیال سوجھا تھا کہ سب ایک ایک گانا سنائیں۔ جوان
دلوں پر چاندنی راتوں میں گانے کا اثر بہت عجیب ہوتا ہے اور اس رات کا منظر تو سحر آگیں
تھا۔ اس رات جو برہا کا گیت زمان نے گایا تھا وہ ساری عمر کے لیے اس کے ذہن میں بالکل
اسی طرح محفوظ ہو گیا تھا جیسے وہ نرگس کا پھول جو وہ سارا دن ہاتھ میں لیے پھرتا رہا
تھا مگر اس نے کسی کو نہیں دیا تھا خود اس کو بھی نہیں کیونکہ وہ گل افروز سے ناراض تھا جسے

اس سے پہلے کی ایک سیر میں شہزور کے نزدیک آتے سب نے دیکھا تھا۔ کوئی باقاعدہ اعلان تو نہیں کرتا مگر بعض نگاہیں بے اختیار لغزشیں اور چہروں کے اتر تے چڑھتے رنگ بھی تو چغلی کھاتے ہیں۔ آخر یہ کیسے ہوتا تھا کہ ہمیشہ سب ساتھ چلتے اور پھر گل افروز اور شہزور بہت پیچھے رہ جاتے یا بہت آگے نکل جاتے۔ اس کے بعد جب وہ نظر آتے تو گل افروز کے بالوں میں افیون کا ننھا سا گلابی یا کاسنی پھول اور شہزور کے کوٹ میں جنگلی گلاب کی کوئی کلی مسکرا رہی ہوتی۔ اسی لیے تو کالام پہنچتے پہنچتے اس کا بھی بے اختیار دل چاہنے لگا تھا کہ زمان خان اس کی طرف اسی طرح دیکھے جیسے شہزور گل افروز کی طرف دیکھتا ہے۔ زمان خان بھی کوئی پھول اس کے بالوں میں لگائے مگر زمان صرف ایسی نظروں سے اسے دیکھتا کہ اونچی پہاڑوں کی برف دھیرے دھیرے پگھلتی ہوئی محسوس ہوتی۔

مگر اس دفعہ جب وہ کراچی سے آنے والے اپنے کزنوں کے ہمراہ سیر کے لیے نکلے تو گل افروز شعیب کے ساتھ اتنی آگے بڑھ گئی کہ وہ کھلے بندوں اس کے بالوں میں پھول لگاتا، اس کا ہاتھ تھام لیتا اور باتیں کرتے ہوئے ہونٹ کانوں کے اتنے نزدیک کر دیتا کہ خود اسے اپنے کانوں کے پیچھے گدگدی محسوس ہوتی۔ کالام پہنچتے پہنچتے وہ ہمیشہ ساتھ بیٹھے نظر آنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ شاید بڑوں نے بھی شعیب کو گل افروز کی پلیٹ سے کباب اٹھا کر کھاتے دیکھ لیا ہو۔

اور اس رات گانا سنتے ہوئے جب یکایک وہ سردی اور جذبات کی شدت سے کانپنے لگی تو اپنا کوٹ لینے اندر بھاگی۔ ابھی اس نے اپنا کوٹ گرم کپڑوں کے ڈھیر سے نکالا ہی تھا کہ لالٹین کی روشنی میں چھت تک جاتے ایک بڑے سے سائے نے اچانک غصے میں پھنکارتے ہوئے کہا۔

"اپنی بہن سے کہہ دینا محبت میں جوائس نہیں ہوتی، محبت اپنا چناؤ خود کرتی ہے۔"

وہ اپنا کوٹ لے کر باہر آگئی تھی مگر زمان اندر ہی رہ گیا تھا۔ اس رات بارہ بجے

تک بھی چاند نہ اُبھرا تھا۔ اس کے باوجود سفید غبار سا ہر طرف چھایا ہُوا تھا۔ جُوں جُوں رات زیادہ ہو رہی تھی اس غبار کی سفیدی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جس طرف سے چاند نکل رہا تھا اس کے بالکل سامنے والے پہاڑوں کی چوٹیوں پر عجیب ملکوتی سی روشنی تھی۔ اس غیر مرئی سفیدی میں اسکول کی عمارت اور چپٹی اور گول ٹین کی چھتیں دُور دُور تک نظر آ رہی تھیں۔ تمام عمارتوں کے ہیولے الگ نظر آ رہے تھے۔ درختوں کی قطاریں اور پہاڑوں کے دیوزاد سلسلے الگ۔ جی چاہتا تھا ساری رات یونہی اس سفید غبار میں کھوئے بیٹھے رہیں۔ سفید اور کالے رنگ کی کاریں اس غبار میں یوں معلوم ہو رہی تھیں جیسے سفید اور کالی بلی کے بچے رات کو ٹھنڈ میں دبکے پڑے ہوں۔ اتنے بہت سے آدمیوں کے باوجود یہ خوبصورت سنّاٹا، چاند نہ ہونے کے باوجود چاندنی، ایسی حسین راتیں اور زندگی میں ایسے تجربے بار بار نہیں آتے۔ شاید یہ ہی سوچ کر سب خاموش باہر بیٹھے رہے اور زمان کا انتظار کرتے رہے۔ مگر وہ اندر سے نہ لوٹا اور جب بھی کوئی بلانے گیا۔ خالی ہاتھ آیا۔ سب حیران تھے کہ یکایک زمان کا موڈ اتنا خراب کیسے ہو گیا۔ یہ تو وہ ہی جانتی تھی کہ زمان اس کو ان گناہوں کی سزا دے رہا تھا جو اس نے نہ کیے تھے۔

رات کو بارہ بجے جب آسمان پر کالے کالے بادلوں نے ڈیرا جمانا شروع کر دیا تو وہ سب سونے اندر چلے گئے۔ بہت دیر تک زمان کے کہے ہوئے جملے اس کے کانوں میں گونجتے رہے پھر اسے نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو آسمانوں کے پرنالوں سے بے تحاشا پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ صبح معلوم ہُوا کہ واپسی کا راستہ بند ہو گیا کیونکہ کئی جگہ پہاڑوں کے ٹکڑے سڑک پر آ گرے تھے اور یوں اس خوبصورت اور آزاد فضا میں جُوں جُوں گُل افروز اور شعیب نزدیک ہوتے گئے۔ زمان اس سے کھنچتا چلا گیا۔ یہ تو واپسی پر پتہ چلا کہ گل افروز کے لیے شہزور خاں کا رشتہ آیا ہُوا تھا

مگر گل افروز شعیب کا ہاتھ تھام چکی تھی اور اس رشتے پر ان کی امّی نے بڑی خوشی سے صاد کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے زمان نے کبھی اس سے نظریں نہ ملائیں۔ چھتیں لگے برآمدے میں آتے جاتے اچانک وہ ٹکرا جاتے مگر زمان نے اپنی آنکھوں کو ہمیشہ اس ٹکراؤ سے الگ رکھا۔ پٹھانوں کے دل اگر ایک طرف پتھّر کے ہوتے ہیں تو دوسری طرف شیشے کے۔ ساتھ اٹھتے بیٹھتے، روتے ہنستے، انتظار کرتے، چار سال بیت گئے۔ مگر اس شخص کے دل پر جمی ہوئی برف پھر کبھی نہ پگھلی۔ وہ اپنی راہ نکل گیا اور وہ بیاہ کر کراچی چلی آئی۔ مگر اسے ہمیشہ یہی محسوس ہوا جیسے اس کے وجود کا کچھ حصہ اس ٹھنڈے دلیس میں نرگس کے پھولوں کے آس پاس کہیں رہ گیا۔ کالج میں، گھر میں، خالہ کے گھر میں ہر جگہ نرگس کے پھولوں کی بھتنات تھی۔ کہیں ایک قطار میں سبز وردی پہنے فوجیوں کی طرح برابر برابر کھڑے ہیں تو کہیں دائرے میں سارے پھول زمین پر یوں نظریں جمائے ہیں جیسے زمین میں گڑے کسی خزانے کی حفاظت پر مامور ہوں۔

وہ بھی تو نرگس کے پھولوں کی طرح چشم براہ رہی۔ شاید زمان خان چشم پوشی کرے اور کبھی پھر اس کی طرف انہیں نظروں سے دیکھے مگر نہیں۔ نرگس کے پودوں اور پھولوں کی قسمت میں صرف انتظار ہے۔ ایک پورے موسم میں وہ اسی طرح چشم براہ راستوں پر نظریں جمائے کھڑے رہتے ہیں۔ وہیں کھڑے کھڑے سوکھ کر زمین میں دفن ہو جاتے ہیں اور اگلے سال اس انتظار کی شدت انہیں دوبارہ وہیں جنم دیتی ہے۔ جنم جنم سے وہ وہیں کھڑے وہیں مرجھاتے اور وہیں سے دوبارہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

مگر کراچی کی آب و ہوا میں یہ شدت بھی تو نہیں کہ مردہ پودوں کو جلا سکے۔ جو ایک مرتبہ مر گیا مر گیا۔ سوکھ گیا سوکھ گیا۔ وہ بھی سوکھ کر مرجھا کر ختم ہو جائے گی۔ مانا کہ گلدان میں نرگس کے پھول جلد نہیں سوکھتے مگر گلدان زمین تو نہیں جہاں سے پودوں کی جڑیں

دوبارہ زندگی حاصل کر لیں۔ خود اس نے اپنی بیٹی میں جنم لیا تو ہے۔ مگر اس کی بیٹی ملیں نرگس
کے پھولوں کی وہ چاہت نہیں ہے۔ اسے بلڈ ریڈ ملٹے بھی بالکل پسند نہیں ہیں۔ اسے
تند مزاج موسم اور انتہا پرست لوگوں سے وحشت ہوتی ہے۔ کیا وہ اپنے خوابوں کی
تکمیل کی خاطر اسے اس جگہ بھیج دے جہاں وہ ساری عمر اجنبی رہے اور پھر ایک دن وہاں
سے اس کی بیٹی بیاہ کر کراچی کی ڈیفنس سوسائٹی میں آتے جو اسے ایک ایسا بڑا سا
گھر نظر آتی ہے جس کے اندر طرح طرح کے بیل بوٹے لگے ہوں۔ دیواروں پر چھت
تک چڑھی ہوئی بیلیں اسے پسند ہیں۔ خوبصورت، خوش لباس بچے، حسین کُتّے، ہر
گھر میں نئی چمکتی تین تین گاڑیاں۔ یہ سب اسے اچھا لگتا ہے۔ صبح دم پھیکی روشنی میں
سوئے ہوئے خوبصورت مکان، ناریل کے دن بھر کراچی کی ہوا میں پنکھوں کی طرح ہلنے والے
جھنتنار درخت، رات کو دور آسمان پر ریفائنری کے دہکتے ہوئے شعلے، یہ سب اسے پسند
تھے اور انہیں چھوڑتے ہوئے اسے بڑی تکلیف ہوگی زمان خان۔ اس نے یہاں کے
ماحول میں آنکھ کھولی ہے اور یہیں پروان چڑھی ہے۔ گو وہ بہت سیدھی سادی لڑکی
ہے مگر اس نے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی مہینوں سے دوپٹہ تیاگ دیا ہے۔ وہ اس بات
پر بہت خوش ہے کہ کراچی میں سردیاں گرمیاں ایک ہلکی سی کُرتی، کاڈرلے کے پجامے
اور چپلوں میں گزر سکتی ہیں۔ اس کے کندھوں نے کوٹ کا بوجھ کبھی نہیں اٹھایا۔ وہ تمہاری
لحاف سے ڈھکی صندلیوں کا رمز نہیں سمجھ پائے گی۔ وہ اس سوسائٹی میں رہتی ہے
جہاں رات کے بارہ بجے لڑکے لڑکیاں ہاتھ گلے کر کے سمندر کے کنارے چلے جاتے ہیں
اور ٹھنڈے گیلے ساحل پہ ننگے پاؤں ناچ ناچ کر صبح کر دیتے ہیں۔ اس نے شاید زندگی
میں کبھی چقیں دیکھی بھی نہ ہوں گی۔ اس کے گھر کے احاطے کی دیوار میں بھی جالیاں ہیں
تو یہ طے ہے کہ اگر وہ یہاں سے نکل کر کہیں اور گئی تو ساری عمر اس پرندے کی طرح
پریشان رہے گی جس کو اپنا گھونسلا نہ ملتا ہو۔

نہیں زمان خان اپنے بچوں میں اب ہم اپنی زندگیاں نہیں گزار سکتے ۔ اس کوشش میں یہ نہ ہو کہ وہ بھی ہماری طرح اندر سے ٹوٹ جائیں ۔ ہمارا زمانہ گزر گیا اب ان کو اپنی راہ جانے دو ۔ ہم تم اپنے کھوئے ہوئے خوابوں کی تعبیر اپنے بچوں کے خوابوں میں نہیں پا سکتے ۔

کوئی بھی اپنے کھوئے ہوئے خوابوں کی تعبیر کسی دوسرے کے خوابوں میں نہیں پا سکتا ۔

رضیہ فصیح احمد

پید: مراد آباد (یوپی)۔
تع: ایم اے (اردو) کراچی یونی ورسٹی۔ ۱۹۷۰ء
سیر و سیاحت: انگلستان۔ بلجیم۔ فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ۔ ڈنمارک۔ یونان۔ سعودی عرب۔
۱۹۴۸ء میں پہلا افسانہ لکھا۔

تصانیف:
(۱) آبلہ پا (ناول) ۱۹۶۴ء
(۲) انتظارِ موسمِ گل (ناول) ۱۹۶۵ء
(۳) اک جہاں اور بھی ہے (ناول) ۱۹۶۶ء
(۴) متاعِ درد (ناول) ۱۹۶۹ء
(۵) آزار عشق (ناول) ۱۹۷۱ء
(۶) دو پاٹن کے بیچ (افسانے) ۱۹۶۶ء
(۷) آنکھ مچولی (بچوں کے لیے کہانیاں) ۱۹۵۱ء
(۸) سیرِ پاکستان (بچوں کے لیے ناول کی شکل میں سفرنامہ) ۱۹۶۵ء
(۹) بے سمت مسافر (افسانے) ۱۹۷۸ء - ۱۹۸۱ء